

آفتاب پبلشرز - گوالمنڈی - لاہور

ایک رومانی اور سماجی ناول

زرینہ

از

منیر کاشانی

ملنے کا پتہ

آفتاب پبلشرز، گوالمنڈی لاہور

قیمت ۴/- روپے

ب

منیر کاشانی

مرتبہ :- منیر کاشانی

ناشر :- ایم، اے، صادق

کتابت :- عبدالقدوس آتش [illegible]

تعداد :- ایک ہزار، پہلی بار

پریس :- حمایت اسلام لاہور

قیمت :- چار روپے علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ

آفتاب پبلشرز گوالمنڈی لاہور

انتساب

سماج کی

ان اصولوں کے نام

جو دو دلوں کو جوڑ بھی سکتے ہیں

اور، توڑ بھی!

میری خوابیدہ امیدوں کو جگایا کیوں تھا
دل جلانا تھا تو دل تم نے لگایا کیوں تھا
مجھ کو اس طرح گرانا تھا اگر نظروں سے
پھر مرے عشق کو سینے میں بسایا کیوں تھا؟

ل

۷۸۶

"نمکینیاں" پیشِ خدمت ہے اِسے پڑھیئے اور دوسروں کو پڑھنے کے لیے دیجیے۔ اِس لئے نہیں کہ اِس میں محاورات کے چٹخارے، مکالموں کی، دِل آویزی، لہجہ کی شگفتگی، زبان کی چاشنی اور ایک ادیب کی حاشیہ آرائی ہے۔

ملکہ

محض اس لیے کہ اس میں پائیں گے آپ اس "سوزِ ناتمام" کو جو آپ کے ساز کے ہر شعر کے ساتھ اُبھرتا ؛ لیکن اسے سننے میں شائد اِس

لیے کوتاہی برتی گئی کہ یہ آپ کی ہمت سے دُور تھا۔ یا اگر سنا بھی گیا تو اسے محض اس لیئے نظر انداز کر دیا گیا کہ یہ آپ کے دِل کی خلش تھی جو سگریٹ کے دھوئیں کی طرح آپ کے دل سے اُبھری اور آہستہ آہستہ سینے کے ساتھ پیوست ہو کر رہ گئی — بالکل اسی طرح جس طرح ساز سے اُبھری ہوئی دھیمی آواز آپ کے کانوں سے سُنی گئی۔ اُف یہ دل کی عمیق گہرائیوں میں ڈوب کر رہ گئی۔

ناول کا "پیش لفظ" ایک فضول سی چیز سمجھا جاتا ہے لیکن پبلشرز کے اصرار اور قلم سے نکلے ہوئے فقرات بالکل اسی طرح آپس میں مل گئے جس طرح ساز کی تاروں سے یکے بعد دیگرے نکلے ہوئے سُر آہستہ آہستہ آپس میں مل کر ایک نغمہ بن گئے............

اب "میں مجبور ہوں"!

میں مجبور ہوں ایک رومانی اور سماجی ناول ہے ایک نصیحت آموز کہانی ہے حسن و عشق کی ایک دلفریب داستان ہے۔ ماضی کا ایک افسانہ ہے حال کی اصلاح اور مستقبل کا فیصلہ ہے

خیر یہ جو کچھ بھی ہے

ایک ـــــ عورت کا احتجاج ہے جس نے سماج کے بدترین اصولوں کو بُری طرح اپنے پاؤں تلے روند ڈالا۔ انہیں پاؤں سے جن پاؤں میں اس کی بہنوں کو سماج کی بیڑیاں پہنائی جاتی ہیں۔

= جس نے اپنے حقوق کی خاطر اپنی ماں کے دوپٹے کو نوچ ڈالا . . . .

= جس نے اپنے باپ کی "دستارِ فضیلت" کے پیچ کھولے اور انہیں سماج کی بلند و بالا عمارت پر کھڑے ہو کر لہرا دیا۔

تاکہ

دُور دراز کے رہنے والے یہ دیکھ سکیں کہ آج سماج کے وہ پھریرے لہرا رہے ہیں جو اپنی بیٹیوں کو بالکل اسی طرح لٹا دیا کرتے تھے۔

لیکن ایک اور صرف ایک فقرہ جسے سُن کر اس نے اپنے سہاگ کو اپنے ماں باپ کی خواہشات پر قربان کر دیا . . . .

یہ فقرہ کس کا تھا؟ یہ جاننے کے لیے آپ کو "زرینہ" کا مطالعہ کرنا ہی پڑے گا۔

جہاں تک مجھے یاد ہے **پیشاور** ٹھیک اکتوبر ۱۹۵۸ء میں لکھا گیا اور
اسے شائع کرانے کے انتظام نومبر ۱۹۵۹ء میں مکمل ہوئے۔ درمیانی خلا
کی ذمہ داری۔ کاغذ کی نایابی یا دوسرے معنوں میں انتہا درجے کی چور بازاری
پر عائد ہوتی ہے۔

دیر آید درست آید ایک مشہور مثل ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ میری کاوش کس حد تک کامیاب ہوئی ہے ا
سے لیے میں آپ کی اصلاح کا طالب ہوں۔ تاکہ دوسری تصنیف ا
غلطیوں سے مبرا ہو جو آپ نے اس میں محسوس کیں۔

ے

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو میرے خرمن کے خوشہ چینیوں کو

منیر کاشانی

۲۹ دسمبر ۱۹۵۹ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا باب

باہر بارش ہو رہی تھی۔ بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ وہ تانگے پر بیٹھ گیا۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز دُور دُور تک سنائی دے رہی تھی۔ کافی مسافت طے کرنے کے بعد تانگہ ایک عالیشان عمارت کے سامنے رُکا۔

"اتریئے بابو صاحب! کالج آگیا ہے۔" ایک آواز ہوا میں اُبھری "ہوں تو کالج آگیا؟" نصیر لڑکھڑاتے ہوئے تانگے سے نیچے اُترا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے نگاہیں اوپر اٹھاتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا۔ بارش ہلکی ہو گئی تھی۔ نصیر تانگے والے کو کرایہ دینے کے بعد کالج کی طرف چل دیا۔ کالج میں ہرے ہرے سُرد کے درختوں سے سرسراہٹ کے ساتھ پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ سڑک کالج کے عقب میں ہوسٹل تک جاتی تھی۔ ہوسٹل کے برآمدے

میں اندھیرا تھا۔ صرف کونے کے ایک کمرے سے روشنی کی چند کرنیں جھانک رہی تھیں۔ نصیر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ایک کمرے کی جانب لپکا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ اسلم اپنے کام میں مشغول تھا۔

"ہیلو مسٹر اسلم! بھئی بڑی دیر تک کام کرتے ہو۔ اس وقت تمام لوگ سو چکے ہیں اور وقت بھی کافی سے زیادہ ہو چکا ہے۔"

"ہاں بس ایسے ہی ہے مگر آپ اس وقت کہاں سے آئے ہیں۔ آج کل کیا مصروفیت ہے کہیں دکھائی ہی نہیں دیتے۔" اسلم نے بیک وقت کئی سوال کئے۔

"آوارہ گردی کرنا ہمارا کام اور جھوٹ بولنا ہمارا لفب العین ہے۔ آج کل انگریزوں سے آزادی کی بھیک مانگنے کے لئے کانگریس کی خدمت کر رہا ہوں۔" نصیر نے جواب دیا۔ "کیا تم مسلمان ہوتے ہوئے بھی کانگرس میں ہی رہو گے"؟

"کانگریس کی کیا بات کرتے ہیں آپ۔ اس پارٹی کا تو کوئی جواب ہی نہیں ہے۔ اس پارٹی سے ہمیں ہر قسم کی امداد ملتی ہے اور اس کے عوض صرف تقریریں کرنی پڑتی ہیں۔ کاریں آتی ہیں اور ہمیں بٹھلا کر لے جاتی ہیں۔ ہم اوٹ پٹانگ تقریروں سے عوام کو اُلّو بنا کر آ جاتے ہیں۔ اور اس کے لیڈر مزے ہی مزے ہیں۔ شام کا سہانا سماں

ہے۔ رقص و سرود کی محفلیں ہیں۔ (COUPLE DANCE) ڈانس ہے۔ ناچ گھر ہے۔ وسکی کے جام ہیں۔ ہم ہیں اور وہ ہیں۔ بس یہی روزمرہ ہے۔"

"نصیر صاحب مسلم لیگ میں کیوں نہیں ہو جاتے جو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور مسلمانوں کے حقوق کی خاطر بڑے خلوص سے کام کر رہی ہے۔ تاکہ ایسا ہی جھوٹ موٹ بول کر آپ پاکستان حاصل کرنے کی کوشش کریں۔"

ملک کی آزادی کے لیے سیاسی جماعت کا منظم ہونا نہایت ضروری ہے۔ مسلم لیگ اول تو ایسی پارٹی ہے، جسے پارٹی ہی نہیں کہا جا سکتا۔ اسے عوام کا اعتماد بھی حاصل نہیں۔ پھر ہندوستان کی تمام سیاسی و مذہبی جماعتیں اس کی مخالف ہیں۔ ایسے میں کون امید رکھ سکتا ہے کہ یہ پارٹی کامیاب ہو گئی۔"

"حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی جماعت صرف مسلم لیگ ہے جو مسلمانوں کے لیے پاکستان حاصل کرنے میں سرگرم کار ہے۔ دوسری طرف کانگریس صرف ہندوؤں کی جماعت ہے۔ جو دوسری پارٹیوں کو رشوت دے کر مسلم لیگ کا مخالف بنا رہی ہے۔ ہندو کانگرسی اکثر مسلمان مقررین کو رشوتیں دے کر اپنا ہم نوا بناتے ہیں تاکہ وہ اکھنڈ

بھارت کی حمایت میں تقریریں کر کے عوام کو کانگریس کا ہم خیال بنائیں۔ نام نہاد نیشنلسٹ مسلمانوں کی سمجھ میں یہ بات آجائے اور وہ اپنی آزادی کو ہندوؤں کے ہاتھوں یوں کوڑیوں کے مول نہ بیچیں"۔

کمرے کی بند فضا میں نصیر کا نشہ بڑھ چکا تھا۔ جس کا اثر اس کی ٹانگوں سے ظاہر ہوتا تھا۔ اس نے بلند آواز سے کہا

"کتنی مسلمانوں کا فکر کرتے ہیں آپ! مسلمان قوم کو مرے ہوئے مدت گزر چکی ہے۔ اب تو ہمیں کوئی اور ہی مذہب تلاش کرنا چاہیئے۔ ایک ایسے ملک کو حاصل کرنا چاہیئے جس کی فضا ہر وقت ناچتی رہے۔ جہاں ہر وقت ساقی و مینا کی محفلیں گرم رہیں۔ جہاں کا ماحول ہر وقت خنداں ہی خنداں نظر آئے۔ جہاں ہر چیز کی آزادی ہو۔ تقریر کی آزادی...... تحریر کی آزادی ..... پینے کی آزادی...... عورت کی آزادی........ ناچ کی آزادی اور نصیر لڑکھڑاتے ہوئے ناچ ...... ناچ........ ناچ کہتا ہوا دھڑام سے میز پر گر پڑا۔ اسلم نے جلدی سے اسے کندھوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا۔

"مسٹر نصیر! کیا تم شرابی بھی ہو"۔ اسلم نے حیرت سے کہا

"دنیا کی ہر حکمران قوم کو پینے اور ناچنے میں آزادی حاصل ہے۔ ہمیں بھی ایسی ہی آزادی ملنی چاہیئے اور ہمیں یہ آزادی ضرور ملے گی۔۔

ضرور ملے گی" نصیر نعرے لگاتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔
اسلم اس واقعہ سے بہت متاثر ہوا۔ اور وہ رات بھر یہی سوچتا رہا کہ جن نوجوانوں سے قوم کو بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ جو نوجوان اپنی کوششوں سے قوم کی ہر مصیبت دور کر سکتے تھے۔ افسوس وہ نوجوان اپنی تمام تر کوششیں کانگریس کی حمایت میں صرف کر رہے ہیں۔ اور کانگریس انہیں اپنے چاندی کے سکوں سے شراب نوشی اور رقص وسرود میں گم کر چکی ہے۔ تاکہ آج انہیں یہ سوچنے کا موقع ہی نہ ملے کہ آزادی کی جدوجہد کرنے کے باوجود بھی یہ لوگ غلام کے غلام ہی رہیں گے۔ اب انگریزوں کے غلام ہیں پھر ہندوؤں کی غلامی کا جوا پہن کر حیوانوں سے بدتر زندگی بسر کریں گے۔ اسلم کے سینے میں انتقام کے شعلے بھڑک اٹھے اس نے فیصلہ کیا کہ کل ہی ان تمام مسلمان طلبہ کو جو اس کے ہم کالج ہیں۔ ایک دعوت پر بلائے گا تاکہ صحیح صورت حال ان کے سامنے رکھے اور ان کی آنکھوں کے سامنے سے وہ پردہ چاک کرے جو کانگریس کے پجاریوں نے اپنی لچھے دار تقاریر سے ڈال رکھا ہے۔ اسلم نے فیصلہ کر لیا کہ وہ مسلم لیگ کے لئے باقاعدہ تنظیم سے کام کرے گا۔ کالج میں مسلمان طالب علم چند اور ہندوؤں سکھوں کے علاوہ عیسائیوں کی اکثریت تھی۔ دوسرے

دن اسلم نے گرین لینڈ ہوٹل اینڈ ریسٹورینٹ میں مسلمان ساتھیوں کو چائے کی دعوت پر بلایا۔

دوسرے دن تمام مسلمان طلبأ مقررہ جگہ پہ ٹھیک وقت پر پہنچ گئے۔ کمرہ نمبر 7 ہوٹل کی بالائی منزل پہ تھا۔ اور دوسرے کمروں کی نسبت کہیں بڑا تھا۔ ایک گول دائرے کی شکل میں کرسیاں اور میز رکھے گئے تھے۔ میزوں پہ سفید رنگ کے رومال بچھائے گئے تھے۔ جن کے اوپر بڑے قرینے سے کیک، پیسٹری اور دیگر چائے کا سامان رکھا گیا تھا۔ چار بجے اسلم ایک خطیبانہ انداز سے اٹھا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے ان چودہ مہمانوں کے مسکراتے ہوئے چہروں کا ایک نظر سے جائزہ لیا۔ اور اس کے بعد یوں گویا ہوا۔

میرے ساتھیو!

ممکن ہے آپ یہ سوچ رہے ہوں۔ کہ آخر وہ کونسی وجہ ہو سکتی ہے۔ جس نے ہمیں اپنے کالج سے دور اس حالت میں یہاں بیٹھنے پر مجبور کیا۔ لیکن پھر بھی سب سے پہلے مجھے آپ سب بھائیوں کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ آپ میری ایک معمولی سی دعوت پر تمام ضروری امور کو لیں پشت ڈال کر اپنے بیش قیمت وقت میں یہاں پہنچ گئے۔ آج ہندوستان کی تمام اقوام جن میں ہندو مسلمان اور سکھ برابر

کے شریک ہیں۔ اپنے مستقبل کو روشن کرنے کے لئے سرگرم کار ہیں۔ مختلف سیاسی پارٹیوں کی طرف سے مختلف تحریکیں چلائی گئی ہیں۔ جنہیں کامیاب بنانے کے لئے عوام نے اپنے قیمتی خون کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہ کیا۔ یہ تو ہر ذی عقل جانتا ہے کہ جب تک یہاں کے عوام اپنے کندھوں سے انگریز کی غلامی کا جُوا اتار کر نہ پھینکیں گے اس وقت تک یہاں کی قوم بھی اپنے مستقبل کے بارے میں کسی خوش فہمی کو اپنا نہیں سکتی۔ آزادی حاصل کئے بغیر ہمارے سنہرے سپنے ادھورے ہی رہینگے۔ لہٰذا سب سے پہلی چیز آزادی ہے۔ اس کے لئے عرصہ دراز سے کوشش کی جاتی رہیں اور کی جا رہی ہیں۔ اس وقت سب سے بڑی سیاسی جماعت جیسا کہ آپ جانتے ہیں کانگریس ہے۔ کانگریس کا شروع سے ہی یہ وطیرہ رہا ہے کہ سب سے پہلے انگریزوں کو ہندوستان سے نکالا جائے اور اس کے بعد ایک حاکم قوم کی حیثیت سے ہندوستان کی دیگر تمام اقوام کو اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیا جائے۔ اس مقصد میں کامیاب ہونے کے لئے ان مطلب پرست لوگوں نے چند راشی سیاست دانوں اور خطیبوں کو جو اپنی آواز طوائف کی آواز کی طرح فروخت کر کے قوم کو اغوا کرتے ہیں۔ بڑی بڑی مراعات دے کر اپنا ہم خیال بنا رکھا ہے۔ خدا کے فضل

سے مسلمانوں کے چند رہنماؤں نے بر وقت اس خطرے کو محسوس کیا اور مسلم لیگ کا جھنڈا پکڑ کر وہ لوگ ہمارے سامنے آئے۔ ابتدا میں تو کانگریس مسلم لیگ کے وجود ہی سے منحرف تھی۔ اور اب مسلم لیگ کی تحریک کو بے جان کرنے کی فکر میں ہے۔ ہماری قوم کی اکثریت اَن پڑھ ہے اور اپنے اچھے بُرے کی پہچان نہیں رکھتی۔ اس صورتحال کے پیش نظر اب سے یہ نوجوانوں کا کام ہے۔ کہ اپنی قوم کے ہر فرد کو اس کے اچھے بُرے سے واقف کریں اور بتائیں کہ ان کی بھلائی کے لئے کام کرنے والی صرف ایک جماعت مسلم لیگ ہے۔

یاد رکھئے! قدرت کسی بھی قوم کی سیاسی غلطیوں کو ہرگز معاف نہیں کیا کرتی۔ جن دنوں انگریز یہاں آئے ان دنوں مسلمانوں کے کئی رہبروں اور حاکموں نے اپنی غلطیوں سے ساری قوم کی نیا ڈبو دی تھی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم آج تک آزادی کو ترس رہے ہیں۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارا کالج شہر کے ہنگاموں سے دور ایک علیحدہ بستی میں ہے اور یہاں کے سب طالب علم دور دراز کے شہروں سے آئے ہوئے ہیں۔ کالج کے منتظمین اگرچہ ہندو یا سکھ ہیں مگر حقیقت میں وہ کسی بھی مذہب یا فرقے سے تعلق نہیں رکھتے۔ اس لئے ان میں کسی قسم کا تعصب نہیں ہے۔ ان کا صرف

ایک ہی مقصد ہے اور وہ یہ کہ ہم ہندوستان کے عوام میں سے ایسے نوجوان پیدا کریں جو مستقبل قریب میں ہندوستان کو آزاد کرا سکیں۔

ہمیں اس کالج میں مسلم لیگ کے اصولوں کی روشنی میں اپنے عوام میں سیاسی شعور پیدا کرنے کا موقع مل سکتا ہے ہمیں چاہیئے کہ اس بستی کے ہر مسلمان گھرانے میں مسلم لیگ کی آواز پہنچا دیں۔ اور مسلمان زن و مرد کو پاکستان کی ضرورت کا احساس کرائیں۔

اِن الفاظ کے ساتھ میں اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں۔ اور امید رکھتا ہوں کہ آپ میری تجویز سے اتفاق کریںگے۔ میں آپ کی تشریف آوری پہ دوبارہ شکریہ ادا کرتے ہوئے دلی مسرت محسوس کرتا ہوں۔

تالیوں کے شور میں اسلم مسکراتا ہوا بیٹھ گیا۔ چائے کا دور شروع ہوا تو چائے کی پیالیوں کی کھنکھناہٹ سے بھی "پاکستان زندہ باد" کی آواز آتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ نصیر کے سوا ہر طالب علم نے مسلم لیگ کے لئے اپنی خدمات پیش کیں اور "اسلم زندہ باد" کے پُر شگاف نعروں میں یہ تقریب ختم ہو گئی۔

دوسرا باب

دوسرے دن انہوں نے مسلم لیگ کو اپنی خدمات سے مطلع کیا۔ چنانچہ گاہے گاہے یہ دور دراز کے قصبوں اور شہروں سے جاکر تقریریں کرتے اور عوام کے سامنے صحیح صورتِ حال پیش کرتے۔ اسی طرح شب و روز کام ہوتا رہا۔ اور انہیں اپنے مشن میں ضرورت سے کہیں زیادہ کامیابی بھی نصیب ہوئی۔ آخر ایک وہ دن بھی آیا جب انہیں مسلم لیگ کے صدر دفتر کی طرف سے ایک ٹائپ شدہ خط موصول ہوا۔ جس کا متن یہ تھا۔ "کہ اب آپ تیزی کے ساتھ گرد و نواح میں سکونت پذیر ہو جائیں کیونکہ ہندوستان عنقریب تقسیم کر دیا جائیگا۔" لہٰذا موقع کو غنیمت جانتے ہوئے انہوں نے فوراً اپنا ضروری سامان سمیٹا اور کالج کے پرنسپل کی خدمت میں ایک درخواست پیش کی کہ حالات ناساز گار ہوتے جا رہے ہیں اور مسلم لیگ نے ہمیں بر وقت

مطلع کرکے لاہور آنے کی ہدایت کی ہے۔ لہذا ہمیں کالج کی طرف سے سرٹیفکیٹ ارسال کر دیں تاکہ ہم لاہور میں جاکر آسانی سے دوسرے کالجوں میں داخلے کر مقررّہ وقت پر یونیورسٹی کے امتحان میں شامل ہو سکیں۔ جس کا انہیں جواب ان الفاظ میں ملا کہ ہم اگرچہ اپنے لباس و۔ رہائش سے ہندو دکھائی دیتے ہیں مگر حقیقت میں ہم کسی بھی فرقے سے تعلق نہیں رکھتے۔ ہماری نگاہ میں سب بھائی بھائی ہیں۔ ہمارے دلوں میں کسی قسم کا تعصّب نہیں۔ اگر ملک پر کسی قسم کی مصیبت نازل ہوئی تو ہم کسی پر آنچ نہیں آنے دیں گے آپ کی پوری طرح حفاظت کی جائے گی۔ اور آپ کو محفوظ مقامات پہ پہنچانے کے لئے کوئی دقیقہ فرد گزاشت نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ یہ سب مطمئن ہو گئے اور بے فکر ہو کر اپنے خیالوں میں گم سم رہے۔

۱۴ اگست ۴۷ء کو شام کے سات بجے سب ڈائننگ ہال میں کھانا کھا رہے تھے کہ ریڈیو سے ایک سرکاری اعلان ہوا کہ آج ۱۴ اگست کو برٹش گورنمنٹ کے گورنر جنرل لارڈ مونٹ بیٹن نے ہندوستان کو تقسیم کر دیا ہے۔ پاکستان کے گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح نے تمام اختیارات سنبھال لئے ہیں۔ پاکستان میں مندرجہ ذیل صوبے مسلمانوں کی اکثریت کی وجہ سے شامل کئے گئے۔

۱:۔ مشرقی بنگال ۲:۔ صوبہ سندھ ۳:۔ بلوچستان ۴:۔ مغربی پنجاب
۵:۔ صوبہ شمال مغربی سرحد۔

تمام ریاستوں کو اختیار حاصل ہے کہ وہ جس ملک کے ساتھ چاہیں الحاق کریں۔

اِس اعلان کے سنتے ہی ہر طرف کھلبلی مچ گئی۔ ہندو اور سکھ طلباء نے اپنے ہی ہم جماعت مسلمان طالب علموں کو زدوکوب کرنا شروع کردیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کالج کے پرنسپل صاحب بھی وہاں تشریف لائے جنہیں دیکھتے ہی سب گھبرا کر اپنی اپنی مخصوص نشستوں پر سمٹ کر بیٹھ گئے۔ اس اداکاری کو دیکھ کر پہلے تو پرنسپل صاحب تمسخرانہ انداز میں مسکرائے اور بعد میں بڑے خطیبانہ انداز میں اعلان فرمایا

"ان تمام مسلمانوں کو قتل کر ڈالو۔ یہ ہمیشہ سے ہی ہمارے دشمن چلے آ رہے ہیں۔"

یہ سنتے ہی سارے ڈائننگ ہال میں طوفان مچ گیا۔ فریقین نے پلیٹوں، کھانے کے برتنوں، میزوں کرسیوں کو اپنا اپنا ہتھیار بنا کر اپنے دشمن کا مقابلہ کرنا شروع کردیا۔ کافی دیر میدان گرم رہا اور آخر مسلمانوں کو کالج کے ہال میں پناہ لینی پڑی۔ ہال کے دروازے بہت مضبوط تھے جنہیں ان سب نے توڑنے کی حتی المکان کوشش کی مگر کامیابی حاصل نہ

کر سکے۔ مسلمان دو دن تک وہاں چھپے رہے۔ ہندوؤں اور سکھوں کو یقین ہو چکا تھا کہ اب یہ لوگ باہر نہیں نکلیں گے اور اندر ہی تڑپ تڑپ کر جاں بحق ہو جائیں گے۔ قرب و جوار کے قصبوں میں لوٹ مار شروع ہو چکی تھی۔ لہٰذا یہ لوگ مسلمانوں کی جائیدادوں کو سمیٹنے میں مصروف ہو گئے ایک دن بھوک اور پیاس سے تنگ آ کر ان قیدی مسلمان طالب علموں نے متحد ہو کر پختہ ارادہ کر لیا یا تو اب مقابلہ کر کے مر جائیں گے یا پھر یہاں سے فرار ہو جائیں گے۔ چنانچہ جب یہ باہر نکلے تو صحن میں کوئی نہ تھا۔ فوراً کالج کی عقبی دیوار پھاند کر باہر دوڑے۔ اس اثناء میں ان لوگوں کو بھی اس حرکت کا علم ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے ان کا پیچھا کیا۔ کوئی ایک میل تک یہ اسی طرح بھاگتے رہے۔ دوپہر ڈھل چکی تھی۔ تھوڑی دور آبادی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ ٹانگوں نے مزید بھاگنے سے جواب دے دیا۔ پاس ہی ایک کار کھڑی تھی۔ چنانچہ جلدی سے جتنے بھی اس میں سوار ہو سکے ہو گئے۔ اسلم کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ کار کو لیکر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تقریباً دو میل مسافت طے کرنے کے بعد کار کا پٹرول ختم ہو گیا۔

شام کے آثار نمودار ہو چکے تھے۔ سورج کا چہرہ بھی اس دنیائے فانی کو الوداع کہتے ہوئے سرخ ہو چکا تھا۔ سڑکوں پر سکھ بڑی بڑی

کرپانیں اور تلواریں ہاتھوں میں لئے اِدھر اُدھر آجا رہے تھے جنہیں دیکھتے ہی یہ ایک ... بڑ کے درخت کے موٹے تنے کے پیچھے چھپ کر اپنے بچاؤ کی تدابیر سوچنے لگے۔ آخر صلاح و مشورے سے یہ فیصلہ ہوا کہ اس وقت یہاں کسی گھنے سے کھیت میں چھپ جانا چاہیئے۔ آدھی رات کے وقت جب یہ لوگ آرام سے سو رہے ہوں تو ہم سفر کریں گے۔ چنانچہ جیسی تدبیر سوچی تھی ویسے ہی کیا گیا۔

صبح کے وقت جب یہ ایک بستی کے قریب پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں۔ کہ سِکھوں کا ایک غول ہاتھوں میں کرپانیں اٹھائے بے تحاشا ان کی طرف بھاگتا ہوا آ رہا ہے۔ ان کے پاؤں تلے زمین نکل گئی۔ چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ چنانچہ یہ فوراً اس بستی کی طرف بھاگ گئے۔ جہاں کسی کو جگہ ملی اس نے اپنے آپ کو چھپا کر محفوظ ہونے کی کوشش کی۔ تھوڑی دور اسلم ایک عالیشان بلڈنگ کے اندر جا کر چھپ گیا۔ چند ساعت کے گزرنے پر جب اس کے ہوش و حواس ٹھکانے ہوئے تو اس نے اپنے بائیں جانب ایک دروازہ کھلا ہُوا پایا۔ وہ جلدی سے اس دروازے کے ذریعے اندر داخل ہو گیا۔ ایک کافی لمبا کمرہ تھا۔ جس کی چوڑائی بہت کم تھی۔ جب یہ مسافت بھی طے ہو گئی تو اس نے اپنے سامنے ایک بند دروازہ پایا۔ جو اس کمرے کے آخیر میں عقبی

دیوار کے ساتھ منسلک تھا۔ تھوڑی سے جنبش سے دروازہ کھل گیا۔ دروازے کے ساتھ ہی تین سیڑھیاں تھیں اور سامنے ایک پارک تھا۔ پارک کے چاروں طرف پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ ان کیاریوں کے اوپر خوبصورت رنگ برنگ کی تتلیاں اپنی مخصوص اٹھکھیلیوں سے بھینی بھینی خوشبو کے مزے لے رہی تھیں۔ اس پارک کے عین وسط میں ایک صاحب اپنی پوری فیملی کو لئے بیڈمنٹن کھیل رہے تھے۔ اسلم نے سب سے پہلے اس تمام فیملی کے چہروں کا جائزہ لے کر یہ معلوم کرنا چاہا کہ آیا یہ مسلمان ہیں یا ہندو؟ وہ کافی دیر تک ان کو گھور گھور کر دیکھتا رہا۔ اس نے ان کے دلوں کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی۔ اور آخر اس نتیجے کو پہنچا کہ یہ مسلمان ہی ہیں۔ یہ کبھی ہندو نہیں ہو سکتے اس کی لڑکیوں اور بیوی کے ماتھے پر کوئی قشقہ نہیں ان کی گردنوں میں کوئی زنار نہیں۔ اس لئے اسلم بالکل مطمئن ہو گیا۔ اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے اس جگہ پہنچ گیا۔ جہاں وہ کھیل میں مصروف تھے۔ وہ اپنے کھیل میں اس قدر محو تھے کہ کسی کو اسلم کی موجودگی کا علم تک نہ ہو سکا۔

اسلم تھکن سے چور ہو چکا تھا۔ اس لئے وہیں بیٹھ کر جہاں وہ کھڑا تھا اپنے پاؤں آہستہ آہستہ دبانے لگا۔

اسلم ابھی بیٹھنے کے بعد سنبھلنے بھی نہ پایا تھا۔ کہ دونوں طرف

سے آوازیں بلند ہونی شروع ہوئیں۔

"ویری گڈ شارٹ...... اُو! ویری گڈ اوم پرکاش..
.... ماتا جی کی جے۔"

اسلم انگشت بدنداں ہو کر تلملا اٹھا۔ خدایا تو ہی بتا کہ یہ کیا ہوا۔ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ جھٹ پاؤں جھاڑ پٹ سے جوتا سر پہ رکھ کر بھاگ نکلا۔ ہر دم یہ شور ہوا مار چلا مار چلا۔ چور...... چور... .... چور کی آوازیں اس کے کانوں تک پہنچتے ہی اس کی ٹانگوں میں لغزش کا باعث بنیں۔ آنِ واحد میں وہ برابر کی کوٹھی میں داخل ہوا۔ دروازے کے ساتھ ہی سرو کے بوٹوں کا سلسلہ کافی دور تک چلا گیا تھا۔ وہ درمیان میں سے ایک سرو کے بوٹے کے پیچھے چھپ گیا۔ چند مسکراتے ہوئے قہقہے اس چور کو ڈھونڈنے کے لئے آئے۔ بلند قہقہوں نے ان سرو کے بوٹوں کی بہاروں کو لوٹا۔ وحشت بھری نگاہوں نے اس چور کو ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ مگر ناکام واپس ہوئے۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد اسلم لرزتا، گرتا، پڑتا، اٹھتا، بیٹھتا، گھبراتا اور سہمتا ہوا باہر نکلا۔ اس کے دل میں امیدوں کے تمام پھول مرجھا چکے تھے۔ تاہم وہ چھپتا چھپاتا کسی نہ کسی کی امید کا سہارا لے لیتا اور کبھی کسی دیوار کی اوٹ میں ہو جاتا۔ خیال تھا کہ اس راہی کی تمام

مسافت طے ہو چکی ہے اور یہ اس کی زندگی کی آخری منزل ہے جسے کسی بھی وقت سکھوں کی چمکتی ہوئی تلواریں آخری منزل تک پہنچانے میں کارگر ثابت ہو سکتی ہیں۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ پیچھے سے ایک سیاہ کار آندھی کی طرح تیزی سے بڑھتی ہوئی دکھائی دی۔ اسلم وہیں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ پاس ہی بجلی کا ایک کھمبا تھا۔ اس کے پیچھے ذرا ٹیڑھا ہو کر اس نے اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کی۔ کار ایک سیکنڈ سے پہلے ہی اس کے پاس سے گزر کر کہیں کی کہیں جا پہنچی۔ اور اس کے لئے وہی دن، وہی زندگی کے لمحات چھوڑ گئی۔

وہ پھر اپنی پرانی اداکاری سے چلا اور چلتا ہی گیا۔ جوں ہی اس نے سڑک کا موڑ مڑنے کی کوشش کی وہی کار پھر اس کے پیچھے سے آئی اور تھوڑی ہی دور جا کر رک گئی۔ کار کے رکتے ہی دروازہ کھلا۔ جس سے ایک تیس پینتیس سال کا ایک شخص جو گیبرڈین کا ایک گہرے رنگ کا سوٹ اور ریشمی سرخ رنگ کی نکٹائی لگائے ہوئے تھا نکلا اور نکلتے ہی اس نے اپنا ہاتھ دوبارہ کار میں بڑھا دیا جس سے ایک دوشیزہ جو سفید رنگ کی ساڑھی میں ملبوس تھی کو باہر نکلنے میں مدد دی۔ ایک منٹ کیلئے دونوں نے اس فضا کا جائزہ لیا۔ دوشیزہ نے اپنے سر کو ہلایا۔ اپنی نرم نرم گردن کو حرکت دے کر

زلفوں کو بکھیرا اور پھر اپنے ہاتھ کی کنگھی سے "ان گیسوئے دراز" بلی کی کھال کی طرح ملائم سیاہ بالوں کو سنوارا۔ ساڑھی کی سلوٹیں درست کیں۔ اور خراماں خراماں سامنے کی کوٹھی میں داخل ہو گئے۔ کار کا دروازہ کھلا دیکھ کر اسلم کی تمام امیدیں جنہیں کسی نے ایک مضبوط گرہ سے باندھ رکھا تھا ایک دم اجاگر ہو گئیں۔ اسلم کا دل جو ایک کلی کی طرح بند تھا۔ اب شگفتہ پھول کی طرح کھل چکا تھا۔ اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کار کا کھلا ہوا دروازہ اس کو دعوت دے رہا تھا کہ وہ اس دروازے سے گزر کر ایک نئی زندگی حاصل کرے۔ کار کی چابی ساتھ لٹک رہی تھی۔ اسلم نے ایک نظر چاروں طرف دوڑائی اور دوسری نظر میں وہ کار کا دروازہ بند کر کے کہیں کا کہیں پہنچ چکا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد کوٹھیوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ ایک سیدھی سڑک خدا جانے کہاں جاتی تھی۔ اس کے دونوں طرف ویران چٹیل میدان تھے۔ اسلم ہوا کی سنسناہٹ کے ساتھ کار دوڑاتا ہوا اپنے انجام سے بے خبر کہیں کا کہیں جا رہا تھا۔ کوئی تین چار میل کے بعد کوٹھیوں کا سلسلہ پھر شروع ہوا۔ اسلم نے کار کو روک کر کوٹھیوں کے دروازوں پر لگی ہوئی تختیوں پر لکھے ہوئے

نام پڑھنے شروع کئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہاں کی تمام آبادی مسلمانوں کی ہی تھی۔ جب اس نے دو چار کوٹھیوں پر مسلمانوں کے نام پڑھ لئے تو وہ بالکل مطمئن ہوگیا۔ دو چار کوٹھیاں چھوڑ کر وہ ایک لال رنگ کی کوٹھی کے دروازے پر رُکا۔ جس کی دیوار میں ایک سنگِ مرمر کی تختی پر "شیخ انتظار حسین" کا نام کندہ تھا۔

دروازے کے سامنے ایک چھوٹا سا پارک تھا۔ چاروں طرف گملوں کی قطاریں تھیں۔ ایک پندرہ سولہ سالہ سال کی دوشیزہ جس نے مٹر کریب کی سفید شلوار ، پھولدار کریب کی قمیص زیب تن کی ہوئی تھی۔ سفید شفون کا دوپٹہ اس نے اپنی گردن کے گرد دوہرا کیا ہوا تھا۔ فوارہ ہاتھ میں لئے خوشنما پھول دار گملوں کو پانی دے رہی تھی۔ اس کی خوبصورتی کا عکس پانی میں ڈوب کر دُور سے ہی دکھائی دے رہا تھا۔ فضا رقص کر رہی تھی۔ حسن بکھر رہا تھا۔ بہاریں خوشیاں منا رہی تھیں۔ ہلکی ہلکی ہوا کے جھونکوں سے ان گملوں کے پھولوں کی ٹہنیاں عجیب انداز سے جھوم کر اس حسین و جمیل کی خوبصورتی میں بے بہا اضافہ کرنے میں مددگار ثابت ہو رہی تھیں۔

اسلم دیر تک کھڑا یہ سوچتا رہا کہ وہ اس لڑکی کو کس طرح خطاب کرے۔ وہ لڑکی اس کی طرف دیکھنے کا نام تک نہ لیتی تھی۔ بلکہ اپنے ہی باغ کے پھولوں کی بہاریں مست تھی۔ کافی سوچ بچار کے بعد وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے

اس کی طرف چلا۔ جب وہ اس کے قریب پہنچا تو اس نے اپنے پاؤں کو زور سے زمین پہ مارنا شروع کر دیا۔ اسلم کے قدموں کی زوردار آواز سے اس نے اپنے سر کو ذرا اوپر اٹھایا۔ اور اسلم کو دیکھتے ہی سہم کر رہ گئی۔ اس نے جلدی سے اپنے دوپٹے کو سر پر سرکاتے ہوئے درست کیا اور دو قدم اس سے اور پیچھے ہو کر شرماتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ ایک طرف معصومیت تھی تو دوسری طرف گھبراہٹ اور ان دونوں کے درمیان فوارہ رکھا تھا۔ اسلم نے ایک حسرت بھری نگاہ سے دیکھا۔ وہ بت بنی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اسلم نے پے در پے اس سے کئی سوال کئے۔

"کیا یہاں شیخ انتظار حسین صاحب رہتے ہیں"؟

"کیا آپ کے والد محترم کا اسم شریف شیخ انتظار حسین صاحب ہے"؟

"مجھ سے گھبرائیے نہیں بلکہ میری مشکل آسان کیجئے"۔

"کیا شیخ صاحب گھر میں موجود ہیں"؟

اندر سے ایک پچاس ساٹھ سالہ ادھیڑ عمر کا ایک مرد سفید پینٹ سفید قمیص پاؤں میں سفید چپل اور گلے میں سیاہ بو لگائے ہاتھ میں موٹے گینڈے کے فریم کی عینک پکڑے آدھمکے اور دور سے ہی سوال کیا

"کونسے شیخ صاحب کے بارے میں پوچھ رہے ہیں آپ"

"میں جی ...... جی ...... جی شیخ انتظار حسین صاحب سے ملنا چاہتا

اسلم کی آواز میں کپکپاہٹ پیدا ہو چکی تھی۔

"چلئے آؤ بیٹا! میں ہی شیخ انتظار حسین ہوں"۔

اسلم کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھائے برآمدے میں داخل ہوگیا۔

"کیا آپ وہی شیخ صاحب ہیں جن سے میں ملنا چاہتا ہوں" اسلم نے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا

"ہاں! ہاں کہو تم کہاں سے آئے ہو؟ کیوں آئے ہو؟ اور کیسے آئے ہو؟"

میرا نام محمد اسلم ہے دہلی کے مشہور سیٹھ ایس۔ ایم۔ اشرف کا فرزندِ ارجمند ہوں۔ پریم نگر کے "آزاد مشن کالج" میں بی۔ اے فرسٹ ایئر کا طالب علم ہوں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ اس کالج کی فنی صلاحیتوں سے متاثر ہوکر دور دراز کے شہروں سے امیر لوگ اپنے اپنے لڑکوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے اور دیگر اغراض و مقاصد کے لئے یہاں بھیجتے ہیں۔ اسی طرح مجھے بھی یہاں بھیجا گیا۔ اسی کالج کے ہوسٹل میں رہا کرتا تھا۔ تقسیم ہند سے قبل مجھے اور میرے پندرہ ساتھیوں کو کسی نہ کسی طرح سے یہ علم ہوگیا کہ ملک کی تقسیم ہونے والی ہے۔ چنانچہ ہم نے لاہور جانے سے پہلے کالج کے منتظمین سے سرٹیفکیٹ طلب کئے مگر ہمیں یہ یقین دلایا گیا۔ کہ پاکستان کی آزادی کے بعد یہاں ہر مسلمان طالب علم کی حفاظت کی جائے گی اور ہمیں

"طالب علم ایک ہیں" کا نعرہ سنا کر مطمئن کر دیا گیا۔ اس یقین دہانی سے
یہاں دہلی میں اپنے والد صاحب کو بھی کوئی اطلاع نہ دے سکا۔ ادھر ریڈیو
سے ہم نے پاکستان کی آزادی کا اعلان سنا۔ ادھر ہماری جانیں خطرے
میں پڑ گئیں۔ جن لوگوں نے ہماری حفاظت کرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔
انہیں لوگوں کے ورغلانے پر کالج کے ہندو اور سکھ ساتھیوں نے ہمیں بارہا
جان سے ہلاک کرنے کی کوششیں کیں لیکن قدرت نے ہمیں ان موذیوں
سے بال بال بچا لیا۔ اس کے بعد ہم ایک کار میں فرار ہوئے راستے میں پٹرول
ختم ہو گیا۔ قریب ہی کھیت تھے۔ ہم نے کماد کے ان کھیتوں میں چھپ کر
اپنی جانیں بچائیں اور گنے چوس کر بھوک اور پیاس کی شدت کو کم کیا.....

ہمارے قریب سے سکھ کرپانیں اور تلواریں ہاتھوں میں لئے گزرتے
رہے۔ آدھی رات کے وقت ہم نے ان کھیتوں سے نکل کر پیدل سفر کرنا
شروع کیا۔ صبح کو ایک بستی کے قریب پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ دائیں
جانب سے سکھوں کا ایک جتھہ ہاتھوں میں برچھیاں اٹھائے بالکل
وحشیانہ ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔ ہم انہیں دیکھتے ہی اپنی جانیں لیکر
بھاگے۔ جہاں کسی کو پناہ ملی وہاں چھپ گیا۔ میں ایک عالیشان بلڈنگ
میں گھس گیا۔ بلڈنگ کے عقب میں ایک خوبصورت گراؤنڈ تھی۔ جہاں
پورا خاندان بیڈمنٹن کھیل رہا تھا۔ یہاں میں نے اپنے آپ کو محفوظ پایا

اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ مسلمان ہی ہیں ان کے قریب گیا مگر جلد ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ چنانچہ میں وہاں سے بے تحاشا بھاگا۔ انہوں نے مجھے چور جان کر پکڑنے کی کوشش کی۔ ان کے قریب ہی ایک بہت بڑی کوٹھی تھی۔ میں نے اس کوٹھی کے صحن میں لگے ہوئے سرو کے پودوں کے نیچے اپنے آپ کو چھپایا۔ وہ مجھے ڈھونڈنے کے لیے آئے اور ایک سرسری نگاہ ڈال کر چلے گئے۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد وہاں سے گھبرایا گھبرایا سا نکل کر چھپتا چھپتا آگے بڑھا۔ ایک سیاہ کار میرے پاس سے گزری اور تھوڑی دور جا کر رُک گئی۔ ایک مرد اور ایک عورت اس کار سے نکل کر سامنے والی کوٹھی میں داخل ہو گئے۔ میں فوراً کار میں بیٹھ کر یہاں آ پہنچا۔ کار اسی بستی کے قریب ہی کھڑی ہے آپ چونکہ مسلمان ہیں اس لیے میں آپ کے پاس چلا آیا ہوں۔ میرے والدین کا مجھے کوئی علم نہیں۔ براہ کرم مجھے اس وقت تک پناہ دیجئے جب تک پاکستان پہنچنا نصیب نہیں ہوتا۔ میں اس زمین، اس آسمان اور اس فضا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ کے اس احسان کا بدلہ جلد از جلد اتارنے کی کوشش کروں گا۔

اسلم اتنا کچھ کہہ چکا تھا کہ شیخ صاحب کو مزید سوال کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ تھوڑی دیر تک وہ دونوں خاموش رہے فضا

خاموش رہی اور وہ ماحول خاموش رہا، جس ماحول میں وہ کھڑے تھے۔ اور آخر شیخ انتظار حسین نے یوں اس مہر خاموشی کو توڑا۔

"ہم اگرچہ صاحبِ پسر نہیں لیکن پھر بھی ہم اپنے سینے میں باپ کا دل رکھتے ہیں"۔

اسلمؔ کا چہرہ ایک بار پھر مسرت و شادمانی سے ہشاش بشاش ہوگیا۔ اور شیخ انتظار حسین اسلم کو دائیں ہاتھ سے پکڑ کر ساتھ والے کمرے میں لے گئے۔

تیسرا باب

کمرے میں ایک بڑی میز کے گرد چار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ میز کے ایک کونے والی کرسی پر ایک خاتون سلائی ڈورئیے کا قمیص دوپٹہ ساٹن کی سفید شلوار پہنے بڑی سنجیدگی سے "زمیندار" اخبار کا مطالعہ کر رہی تھی۔ شیخ انتظار حسین نے آتے ہی میز سے دو کرسیوں کو باہر کھینچا اور اور اسلم کو بیٹھنے کی دعوت دیتے ہی خود بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ وہ کرسی پر بیٹھنے کے ساتھ ہی کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ میز کے کونے سے آواز آئی۔

"اجی میں نے کہا سنتے ہو کیا کہہ رہے ہیں یہ اخبار والے"۔

"اخبار والے برسوں سے کہتے ہی آ رہے ہیں اور اب تو ان کی سنتے سنتے دل بھی اچاٹ ہوتا جا رہا ہے"۔

"مگر اب جو اخبار والے کہہ رہے ہیں وہ پہلے سے کہیں ذرا مختلف ہے۔ ارشاد ہوتا ہے "ضلع گورداسپور کو ہندوستان میں شامل کر دیا گیا"۔

"گورداسپور کے تمام شہروں اور قصبوں میں سکھوں نے مظالم ڈھانے شروع کر دیئے"۔ "قتل و غارت کی اس سے بڑی اور کہیں مثال نہیں ملتی"۔ "نہتے مسلمانوں کے قافلوں پر سکھ جتھوں کے لگاتار حملے"۔ "نوجوان لڑکیوں کو ماں باپ کی آنکھوں کے سامنے زبردستی بھگا کر لے جایا گیا"۔ "توبہ توبہ اِن مظالم سے تو انسانیت بھی کانپ اٹھتی ہے۔ آوئی اللہ کہیں قیامت تو نہیں آنے والی.......... اے یہ کون صاحب ہیں میں نے تو دیکھا ہی نہیں"

اسلم فوراً اٹھ کر فرشی سلام بجا لایا۔ شیخ انتظار حسین نے اس کا یوں تعارف کرانا شروع کیا۔

"یہ ہیں میاں اسلم صاحب ان کی کہانی سن کر انسان کا دل دہل جاتا ہے۔ دہلی کے ایک مشہور رئیس کے فرزند ارجمند ہیں۔ پریم نگر میں تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ پاکستان بن گیا۔ آپ متعدد بار سکھوں کے نرغے میں آئے مگر ہر بار قدرت نے انہیں بال بال بچایا اور اب یہ ہمارے پاس پناہ کی غرض سے آئے ہیں"۔

یہ کہتے ہی شیخ انتظار حسین کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور میز کے ارد گرد گھوم کر کچھ سوچنے میں محو ہو گئے۔ تھوڑی دیر تک کمرے میں سکوت رہا۔ شیخ انتظار حسین نے میز کے ارد گرد چکر لگاتے

ہوئے اس خاموش فضا میں ایک ہمدردانہ آواز نکالی ....

"تمہاری ماں تمہارا باپ، تمہاری بہنوں اور تمہارے بھائیوں کے دلوں پر خدا جانے کیا بیت رہی ہو گی۔ تمہاری ماں جس نے تمہاری پرورش کرنے میں خدا جانے کتنے جتن کئے ہوں گے۔ خدا جانے کتنی راتیں بے آرام کی ہوں گی اور خدا جانے کتنے دکھ جھیلے ہوں گے۔ تمہارا وہ باپ جس کی آنکھوں کے سامنے جب کبھی تمہاری تصویر کا عکس گزرا اس نے اپنے مستقبل کو ضرور درخشاں و بدخشاں دیکھا ہوگا۔ انہیں یہ فکر نہیں ہوگی کہ وہ ہندوؤں کے پنجۂ استبداد میں جکڑے جا چکے ہیں۔ اور ان کی زندگی خطرے میں ہے بلکہ انہیں تو اس وقت تمہاری زندگی اور موت کی فکر دامن گیر ہوگی۔ ان کے ہاتھ بار بار تمہاری حفاظت کی دعاؤں کے لئے بارگاہِ خداوندی میں اٹھ رہے ہوں گے۔ لیکن خیر جب تک وہ تمہیں نہ ملیں تم ہمیں ہی اپنا ماں باپ سمجھو۔ اس گھر کو اپنا گھر سمجھو۔ میرے نام سے تو تم پہلے ہی سے واقف ہو یہ میری بیگم صاحبہ ہیں۔ انہیں زینت کہتے ہیں اور یہ ہیں بیٹی زرینہ"۔ اسی وقت زرینہ چائے کا ایک سیٹ لے کر کمرے میں داخل ہو چکی تھی۔ چاروں نے مل کر چائے پی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سب آپس کی خوش گپیوں میں الجھے رہے۔ کچھ وقت گزر گیا اور آنے والے وقت

کے لیے راستہ صاف ہوتا رہا۔ کرسی کو تھوڑی سی جنبش ہوئی۔ شیخ انتظار حسین نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"دیکھو بیٹی زرینہ! اسلم میاں کئی دن سے بیدار بھی ہیں اور تھک کر چور بھی ہو چکے ہیں۔ تم انہیں ساتھ والے سونے کے کمرے میں لے جاؤ تاکہ یہ کچھ دیر آرام کر سکیں۔

یہ سنتے ہی اسلم "شکریہ" کہہ کر اٹھا اور زرینہ کے ساتھ باہر آگیا۔

اسلم بستر پر دراز ہوتے ہی گہری نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔ وہ اپنے ماضی، حال اور مستقبل سے غافل میٹھی نیند سے مدہوش ہو چکا تھا کہ شیخ انتظار حسین پسینے سے شرابور، دھڑکتے ہوئے دل، پھڑکتی ہوئی آنکھوں اور کانپتے ہوئے جسم کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتے انہوں نے اپنے پورے زور سے "اسلم میاں" "اسلم میاں" پکار کر اسلم کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ مگر اسلم تو کہیں اور پہنچا ہوا تھا وقت تیزی کے ساتھ گزر رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گھنٹے اب منٹوں میں تبدیل ہو چکے ہیں آخر میں شیخ انتظار حسین نے اپنی پوری قوت کے ساتھ اسلم کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا

"خدا کے لئے اب تو اُٹھیئے! اسلم میاں یہ سونے کا وقت نہیں۔ جد و جہد کا وقت ہے اسلم میاں! قدرت نے ہمارا سکھ چین سب کچھ چھین لیا ہے وقت ہمیں پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اگر کچھ کرنا چاہتے ہو تو

کر لو ورنہ بعد میں پانی سر سے گزر گیا تو پچھتاؤ گے۔ خدا کے لئے اب تو اٹھ جاؤ۔"

جونہی اسلم نے کروٹ بدلی اس کے کانوں میں یہ آواز گونجی "خدا کے لئے اب تو اُٹھ جاؤ۔" اور ساتھ ہی دو آہنی ہاتھ اس کو جھنجھوڑتے ہوئے محسوس ہوئے اسلم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اس کا دل پوری رفتار سے دھڑکنے لگا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے شیخ انتظار حسین کی طرف دیکھا جو اس کے قریب ہی بت بنا کھڑا تھا۔ چند منٹوں کی اس خاموشی کو شیخ انتظار حسین کی کانپتی ہوئی آواز نے توڑا "اسلم میاں! میں ابھی سودا سلف خریدنے بازار گیا تھا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ہمارے ساتھ والے قصبے میں سکھوں نے لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ وہ بدستور پکے مکانات کو نذرِ آتش کر رہے ہیں۔ ایک ہزار افراد پر مشتمل مسلمانوں کا ایک قافلہ دریا کے راستے پاکستان میں داخل ہونے کے لیے روانہ ہوا تھا کہ راستے میں سکھوں نے ان پر حملہ کر دیا اور سینکڑوں لڑکیوں کو زبردستی بھگا کر لے گئے۔ اب ہمارے لیے سوائے بھاگنے کے اور کوئی چارہ نہیں۔ کھانا تیار ہو رہا ہے جس کار پر تم بھاگ کر آئے تھے اگر وہ کار ہمیں وہاں کھڑی مل جائے تو ہمیں کھانا کھاتے ہی کار پر لاہور روانہ ہو جانا چاہیئے۔ آؤ ہم اس کار کو ڈھونڈنے کے لیے باہر جاتے ہیں

اور واپسی پر پٹرول کا بھی انتظام کر آئیں گے۔

وہ دونوں اس جگہ آئے جہاں اسلم کار کھڑی کر کے آیا تھا۔ کار وہاں بدستور کھڑی تھی۔ وہ دونوں جلدی سے اس کار میں سوار ہو گئے۔ شیخ انتظار حسین نے اسے ایک پٹرول پمپ کے قریب کار کھڑی کرنے کو کہا۔ انہوں نے اپنی خواہش کے مطابق پٹرول لیا اور جلدی سے کار کو اپنے بنگلے میں لے آئے اور ضروری سامان کار میں رکھنا شروع کر دیا۔

کھانا تناول کرتے ہی وہ اللہ کا نام لے کر روانہ ہوئے کار پر سوار ہونے سے پہلے شیخ انتظار حسین نے ایک نظر سے اپنی اور ارد گرد کی، کوٹھیوں کو دیکھا۔ شاید اس کے دل کی دھڑکن سے یہ آواز نکل رہی تھی کہ۔

لے درودیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

کوئی دو گھنٹے کے بعد وہ بغیر کسی خوف و خطر کے اپنی مسافت طے کرتے رہے۔ مگر جوں ہی ان کی کار نے بڑی سڑک کا موڑ مڑا ان کی مصیبتوں میں ایک اور مصیبت کا اضافہ ہو گیا۔ سڑک کے دونوں جانب فلک بوس درختوں کو زمین سے کاٹ کر سڑک کے درمیان جگہ جگہ بچھایا گیا تھا۔ تاکہ وقت آنے پر اس بستی کی کوئی مدد نہ کر سکے اور نہ ہی یہاں کے لوگ کہیں آسانی سے بھاگ سکیں۔ راستہ کاٹنا ان کے لئے دو بھر

ہوگیا۔ وہ بڑی مشکل سے درخت کو گھسیٹ کر ذرا پیچھے ہٹا کر کے کار کو آگے بڑھانے چند ساعت کے بعد ایک اور دیو قامت درخت ان کا راستہ روک لیتا آخر مجبوراً انہیں کچا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ کھیتوں کے گرد گھومتا جہاں کہیں اسے راستہ نظر آتا اسلم تیزی سے کار دوڑاتا جا رہا تھا۔ جب یہ مشکل راستہ بھی طے ہوگیا۔ اور سامنے ایک چٹیل میدان نظر آنے لگا تو وہ کچھ مطمئن سے ہوگئے۔ اگرچہ اس اجاڑ میدان میں سفر کرنا بہت تکلیف دہ تھا مگر پھر بھی اسلم پوری رفتار سے کار کو دوڑاتے ہوئے نہایت تیزی کے ساتھ مسافت طے کر رہا تھا۔ متعدد بار ان کی کار مختلف کھڈوں میں گری اور جھاڑیوں سے ٹکرائی مگر اس کی رفتار میں کوئی فرق نہ آیا۔ کافی دیر کے بعد چھوٹی سی ایک نہر ان کے راستے میں آئی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ نہر لاہور کی طرف جاتی ہے اس لئے اسلم نے اس نہر کے کنارے پر بے تحاشا کار کو دوڑانا شروع کر دیا۔ دو چار میل کے بعد نہر کے کنارے ہرے ہرے لہلہاتے ہوئے کھیت دکھائی دئے اور دور دور کہیں کہیں آبادی کے نشانات بھی پائے جاتے تھے۔ ان کے دائیں طرف کھیت تھے۔ اور بائیں طرف نہر اور درمیان میں نہر کا کنارہ جو بہت ہی ڈھلوان تھا اس پر کار چلانا نہایت خطرناک تھا۔ مگر مرتا کیا نہ کرتا اس کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ بھاگنے کے لیے کوئی راہ نہ تھی۔ تھوڑی دیر بعد یہ

مصیبت بھی ٹل گئی۔ نہر پر لکڑی کا ایک پل بنا ہوا تھا۔ چنانچہ بغیر کسی سوچ بچار کے اسلم نے کار کو پل پر سے گزار کر نہر کے بائیں جانب کچے راستے پر ڈال دیا۔ اب کار کے دائیں طرف نہر تھی اور بائیں طرف آبادی تھی جس میں انہیں بعض سکھ کھڑے دکھائی دیتے تھے۔ ایک دو فرلانگ کے بعد یہ آبادی بھی ختم ہو گئی اور کچا راستہ بھی۔ اب ان کے سامنے وہی چٹیل میدان وہی کھڈیں اور وہی جھاڑیاں تھیں۔ اسلم نے کار کی رفتار میں مزید اضافہ کر دیا۔ شیخ انتظار حسین نے اپنی موٹے شیشوں والی عینک اتار کر جیب سے رومال نکالا اور اس سے عینک کے چشموں کو صاف کرتے ہوئے کہا کہ بس اسلم میاں! یہ آخری میدان ہے اسے سر کرنے کے بعد ہم بنفس نفیس شہر لاہور میں انشاءاللہ داخل ہو ہی جائیں گے۔ یہاں سے کوئی چار میل دور ایک بڑی جرنیلی سڑک ہے جو لاہور اور امرتسر کو ملاتی ہے بس اس سڑک پر پہنچتے ہی ہمارا کام ختم ہو جائیگا۔

"ابا جان! ہم لاہور میں نانی جان کے گھر ٹھہریں گے یا پھوپھی رضیہ کے ہاں" پیچھے سے ایک نسوانی آواز کار میں ابھری

"بیٹی زرینہ! جس کا گھر سب سے پہلے آئے گا ہم تو اسکے ہاں ٹھہریں گے۔ ہاں البتہ تم جہاں ٹھہرنا پسند کرو گی تمہیں وہیں پہنچا دیا جائے گا۔ اسلم میاں! ہمارے تقریباً سب رشتہ دار لاہور میں

رہتے ہیں یہ تو ہماری قسمت کو گھن لگ گیا جو عرصہ دو سال سے یہاں آکر پناہ گزین ہوئے۔"

شیخ انتظار حسین ابھی یہ فقرہ مشکل سے ختم کرنے نہ پائے تھے کہ ایک زوردار دھماکے کے ساتھ کار کا ایک ٹائر پھٹ گیا۔ اسلم نے بغیر کسی حیل وحجت کے دوسرا ٹائر بدلنے کے لئے ڈگی سے ایک نیا ٹائر نکالا مگر ہاتھ لگاتے ہی معلوم ہوا کہ اس کی ہوا بھی ہوا ہو چکی ہے آخر چار و ناچار سب سامان وہیں پھینک انہوں نے پیدل سفر کرنے کا ارادہ کیا۔

اس وقت دوپہر قریباً ڈھل چکی تھی۔ یہ آہستہ آہستہ ایک ہی سمت کو بڑھتے گئے۔ تھکنے کے بعد ستانے بھی نہ پاتے تھے کہ انہیں ایک جانب سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ آنًا واحد میں تین گھوڑے ان کی طرف بے تحاشا بھاگتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ان پر تین قدقامت سکھ سوار تھے جنہوں نے زرد رنگ کے لمبے لمبے چولے اور زرد ہی رنگ کی بڑی بڑی پگڑیاں پہن رکھی تھیں۔ تین چمکتی ہوئی تلواریں گھوڑوں کی زین کے ساتھ لٹک رہی تھیں۔ علاوہ ازیں ان سواروں نے تین لمبی لمبی کرپانیں بھی آسمان کی طرف بلند کی ہوئی تھیں اور وحشیانہ طور پر "ست سری اکال" کا نعرہ بلند کر رہے تھے۔ گھوڑوں کے ٹاپوں سے کچھ مٹی ہوا کے سہارے سے گرد کی صورت میں ابھری

اور چند ساعت کے لیے ان کو گھیرے میں لے لیا۔ دوسرے لمحے وہ ان تینوں سواروں کی قید میں تھے۔

"اٹھا لو اس لڑکی کو جو اس وقت ہمارے ساتھ آنکھیں بھی نہیں ملاتی۔" ایک گرجدار آواز کے ساتھ ایک کرپان زمین پر گری اور اس کے ساتھ ہی ایک لمبی مونچھوں اور داڑھی والے نے زمین پر چھلانگ لگائی۔ زرینہ ایک چیخ کے ساتھ اپنے باپ سے لپٹ چکی تھی۔ اور اس کی ماں یہ دیکھتے ہوئے لڑکھڑاتے ہوئے زمین پر گر گئی۔

یہ دیکھتے ہی شیخ انتظار حسین تلملا اٹھا۔ اس کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں بدن میں کپکپاہٹ پیدا ہوگئی آواز تھرتھرانے لگی اس کی آنکھیں پھڑکنے لگیں۔ اس کے ہوش و حواس گم ہوتے گئے۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد ہوتا گیا۔ وہ کبھی اپنی طرف دیکھتا، کبھی زمین کی طرف، کبھی ان سکھوں کی طرف کبھی وہ اس ماحول کی طرف دیکھتا جس ماحول میں وہ کھڑا تھا اور کبھی اس ماحول کی طرف نگاہ دوڑاتا جس ماحول سے وہ گزر کر آرہا تھا۔ کبھی وہ آسمان کی طرف دیکھتا کہ کاش اوپر سے کوئی آئے اور ان سے چھٹکارا دلائے۔

دو آہنی پنجے زرینہ کو بازوؤں سے پکڑتے ہی ایک ہی جھٹکے سے اسے شیخ انتظار حسین سے جدا کر چکے تھے اور دوسرے جھٹکے نے اسے گھوڑے پر بٹھانے کی کوشش کی۔ مگر زرینہ مرغ بسمل کی طرح تڑپتی ہوئی نیچے

گر گئی۔ اتنے میں دوسرے نے جھٹ اپنا پگڑ اتارا اور اسے کھولنے کے ساتھ خود بھی نیچے زمین پر چھلانگ لگادی۔ مگر اس کی پگڑی کے بل اس کی ٹانگوں کے ساتھ الجھ کر رہ گئے۔ اور وہ غیر متوقع زمین پر بُری طرح گر پڑا۔ جس سے اس کے چہرے پر چوٹ تو کچھ ضرورت سے زیادہ ہی لگی مگر اس نے بڑے صبر سے کام لیتے ہوئے جلدی سے اٹھ کر اپنی پگڑی کو زرینہ کے گرد لپیٹنا شروع کردیا جس سے انہوں نے اس کے بازو اور ٹانگوں کو باندھ کر اسے بے حس بنادیا اور اسے گھوڑے پر ادندھا لٹا کر فرار ہونے لگے کہ شفقتِ پدری نے جوش مارا مگر کیا کرتے اس کے ساتھ اپنی بھی موت زندگی کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ اس لیے صرف "میری زرینہ" پر ہی اکتفا کیا۔ بیگم زینت نے بھی لمبے لمبے ہاتھ پھیلا کر اپنے خاوند کی تائید میں میری زرینہ" "میری زرینہ" کی گردان کے تمام صیغے دوہرا ڈالے۔

اسلم اس وقت تک بے سکت بُت بنا کھڑا تھا۔ اس سے یہ جانکاہ واقعہ نہ دیکھا گیا۔ اس کے رگ و ریشہ میں جوانی کا خون کھولنے لگا وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اس کی زندگی کا آخری امتحان یہی ہے ...... یہی ہے وہ آزمائش جس کے لیے خدائے تعالیٰ نے ان کے گھر پناہ لینے پر مجبور کیا تھا۔ اس نے کہا نہیں ...... نہیں ...... آپ نے مجھے پناہ دی تھی۔ آپ نے مجھے ہر امید دلائی تھی۔ آپ نے مجھے اپنا بیٹا بنایا تھا۔ میں نے اس آسمان

اس زمین اور اس فضا کی قسم اٹھا کر یہ کہا تھا کہ آپ کے اس احسان کا بدلہ جلد از جلد اتار دوں گا۔ آج وہ وقت آگیا ہے جس کی میں نے قسم کھائی تھی۔" یہ کہتے ہوئے اسلم کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔

شیخ انتظار حسین نے بڑی مشکل سے زبان نکال کر ہلکی سی آواز میں کہا "اسلم میاں! وہ تین ہیں تم اکیلے ان کا مقابلہ کیسے کروگے"۔ اسلم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

ع مسلم ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

چوتھا باب

اسلم ان کے پیچھے تیزی سے بھاگتا گیا۔ تھوڑی دور جاکر چار یا پانچ جھاڑیوں کا جھنڈ تھا۔ بھاگتے ہوئے گھوڑے ان جھاڑیوں کے جھنڈ سے بچتے ہوئے آپس میں بری طرح ٹکرائے اور ان کا ایک سوار اوندھے منہ ان جھاڑیوں پہ جاگرا۔ اسلم دوڑتا ہوا آیا زمین سے کرپان کو اٹھا کر اس کی شہ رگ پہ مارتے ہی اسے بے حس کر دیا۔ جب اس کا کام تمام کر چکا تو اسلم زرینہ کو، گھوڑے سے اتار کر خود گھوڑا لیکر ان کے پیچھے سرپٹ دوڑا اور پیچھے سے اس کی پسلی پہ کرپان کے ایک ہی وار سے اسے نیم مردہ کر کے تیسرے کیطرف متوجہ ہوا۔ مگر پیشتر اس کے وہ اپنی کرپان سنبھالتا اسلم اپنی کرپان کو اس کے پیٹ میں گھونپ چکا تھا۔ آخر تیسرے کو بھی مرغ بسمل کی طرح تڑپتا چھوڑ کر اسلم واپس ہوا اور زرینہ کو پھر اسی طرح اوندھا لٹا کر گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا واپس اس جگہ آیا جہاں شیخ انتظار حسین اور بیگم زینت آسمان کی طرف

ہاتھ اٹھا کر اس کی کامیابی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ اسلم کو زرینہ کے ساتھ آتا دیکھ کر ان کے چہرے شگفتہ کلی کی طرح کھل گئے۔ اسلم نے جلدی سے زرینہ کے گرد لپٹے ہوئے پگڑی کے بل اتارتے ہوئے کہا

"لیجئے! آپ کی دعائیں کارگر ہوگئیں۔ یہ ہے وہ کرپان جو ان کی تھی اور انہیں ہی ہلاک کر کے میری کامیابی کا باعث بنی"

"اسلم میاں! ہم تمہارا کس منہ کے ساتھ شکریہ ادا کریں تم نے آج اپنی جان خطرے میں ڈال کر ہمارے خاندان کی لاج رکھی ہے" شیخ انتظار حسین نے زرینہ کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا "بیٹا اسلم! اگر وہ نامراد زرینہ کو لے جانے میں کامیاب ہو جاتے تو ہم اپنے رشتہ داروں کو کیا منہ دکھلاتے۔ ہمارا کھاندان ہمیں کیا کہتا کہ اپنی جان کے عوض اپنی بیٹی کو سکھوں کے پاس چھوڑ آئے۔ ایسی حالت میں ہمیں یقیناً یہیں مرجانا پڑتا۔ بیٹا اسلم! ہم تمہارے بہت شکرگزار ہیں اور تمہارا یہ احسان مرتے دم تک نہ بھولیں گے"

بیگم زینت نے اپنے پھولتے ہوئے سانس کو روکتے ہوئے کہا۔ "ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ایسا کرنا میرا فرض تھا۔ آپ میرا بار بار شکریہ ادا کر کے مجھے شرمندہ نہ کریں اور اب جلدی کریں ابھی ہماری منزل کافی دور ہے"۔

شام کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ سورج بھی اپنا سفر طے کر کے آرام کی غرض سے درختوں کے پیچھے چھپ رہا تھا۔ مگر ان کا سفر ہنوز جاری

تھا۔ وہ یاس و امید کے سہارے اس بحر بیکراں میں کود پڑے تھے اور اسی یاس و امید کے سہارے انہیں کنارے لگنا تھا۔ وہ ساری رات بھٹکتے، پھرتے رہے اور دوسرے دن جب سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ طلوع ہوا وہ اپنے اسی لاہور میں پہنچ چکے تھے۔ جس لاہور کو وہ آج سے پہلے خیر آباد کہہ چکے تھے۔ اور جس لاہور پہنچنے کی خواہش نے انہیں راستے میں لاتعداد مصائب سے دوچار کیا تھا۔ سب سے پہلے وہ زرینہ کے ماموں کے گھر پہنچے اور ٹھنڈا سانس لے کر خدا کا شکر بجا لائے۔ ان کے سر پہ آندھی کی طرح امنڈی ہوئی مصیبت بادل کی طرح برس کر ٹل چکی تھی۔

ان کے قریبی رشتے دار اُن کے نہ پہنچنے کی وجہ سے بہت فکرمند تھے۔ زرینہ کے ماموں نے اپنی تمام تر کوششوں سے ان کی خیر و عافیت کی خبریں معلوم کی تھیں جو تمام کی تمام مایوس کن تھیں۔ آخری اطلاع کے مطابق ان کا خیال یہ تھا کہ وہ لاہور آتے ہوئے راستے میں مارے گئے ہیں اس لیئے ان کے تقریباً سبھی رشتے دار تعزیت کے لیے آئے ہوئے تھے کہ عین اس موقع پر اوپر سے یہ پہنچ گئے۔ ہنسی خوشی کے ملے جلے جذبات نے ان کا خیر مقدم کیا۔ بلند قہقہوں اور مسکراتی ہوئی نسوانی آوازوں نے انہیں سینے سے لگایا۔ جب وہ خوب اچھی طرح مل چکے تو انہوں نے اسلم میاں کا ان لفظوں میں تعارف کرایا۔

"یہ ہیں وہ جو نہایت آڑے وقت میں ہمارے کام آئے یہ ہیں وہ جنہوں نے اپنے سر دھڑ کی بازی لگا کر ہماری ایک ایسی خدمت کی جس کا صلہ ہم انہیں تمام عمر بھی نہیں دے سکتے۔"

اس کے بعد انہیں تمام کا تمام واقعہ سنا دیا گیا جسے سن کر ہر ایک نے اسلم کی تعریف کی اور اسے اپنے پاس بیٹھنے کیلئے جگہ دینے کی کوشش کی۔

چند روز بعد انہوں نے ایک مکان الاؤٹ کرا لیا اور وہ سب اس میں جا کر مقیم ہو گئے۔ اسلم کے والدین کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔ حکومت نے ان تمام ملازمین کو جو پہلے ریٹائر ہو چکے تھے کو دوبارہ نئی مراعات دے کر ان کی ملازمتیں بحال کر دی تھیں۔ شیخ انتظار حسین لاہور سیکرٹریٹ کے محکمے سے ریٹائر ہوئے تھے اس لیے وہ دوبارہ وہیں ایک اچھے عہدے پر سرفراز ہو گئے اور اسلم کو بھی انہوں نے اپنی کوششوں سے ایک اچھی پوسٹ پر لگوا دیا۔

اسلم نے لاہور کا کونہ کونہ چھان مارا مہاجرین کے تمام کیمپوں میں جا کر دیکھا مگر اس کے والدین کے علاوہ اسے کسی اور رشتے دار کا بھی کوئی سراغ نہ مل سکا۔ اس نے اپنی کوششیں اور تیز کر دیں اور پنجاب کے دیگر تمام اضلاع سے جا کر معلوم کیا۔ اخبارات میں اشتہارات چھپوائے مگر کچھ نہ بنا آخر تھک ہار کر اسے یہ خیال ہی دل سے نکال دینا پڑا۔ اس نے رو پیٹ کر صبر کیا۔ اور انہیں ہی اپنا والدین بنا کر ان کے پاس ہمیشہ کے لیے رہنے کا عہد کر لیا۔

دن بیت گئے اور ہوتے ہوتے اسے ایک عرصہ ہو گیا اس عرصے میں جس کسی نے اسلم کے بارے میں جو کچھ بھی پوچھا انہوں نے اس کی تعریف کے پل باندھنے شروع کر دیئے اس کے لباس و زیبائش اور خوراک کا، خاص خیال رکھا جاتا۔ جب بھی اسلم میاں دوپہر کو دیر سے گھر پہنچتے اسی دن انہیں تنبیہ کر دی جاتی کہ گھر جلدی پہنچا کریں ورنہ گرمی سے صحت کے خراب ہونے کا احتمال ہے جب بھی کبھی اسلم کو گھر پہنچنے میں دیر ہوئی انہیں کپڑے تبدیل کرنے سے پہلے کہہ دینا ضروری سمجھا گیا کہ میاں سردی کا زور روز بروز بڑھ رہا ہے اگر کہیں سردی لگ گئی تو ٹائیفیڈ ہونے کا خدشہ ہے۔

ذرینہ نے اسلم کو اس دن سے اپنے دل میں جگہ دے رکھی تھی، جس دن اسلم نے اسے مکھیوں کے جنگل سے چھٹکارا دلایا تھا۔ جوں ہی اسلم میاں کمرے سے باہر ہوئے، توں ہی ذرینہ کمرے میں داخل ہوئی اور کمرے میں رکھی ہوئی تمام بے ترتیب چیزوں کو درست کرنے میں وقت صرف کیا۔ میزوں کے رومال جھاڑ پونچھ کر دوبارہ بچھائے جاتے۔ کتابوں کو نئی ترتیب سے سجایا جاتا۔ اس فرض کی ادائیگی کو دو سال کا عرصہ گذر گیا ایک دن وہ حسبِ عادت کمرے کو سجا، بنا اور سنوار کر دیوار میں منسلک شیشے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے بالوں کو سنوار رہی تھی کہ اچانک اسلم میاں کمرے میں آ دھمکے اور اسے دیکھتے ہی مسکرانے لگے۔

زرینہ اسلم کی مسکراہٹ کو شیشے میں دیکھ کر خود بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی وہ پیرس کی سرخ رنگ کی شلوار چکن کی سفید قمیض اور ململ کے سفید دوپٹے کے ساتھ اپنے بالوں کو شانے پہ بکھیرے بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ جب دونوں کی مسکراہٹیں آپس میں مل گئیں تو اسلم نے اس کے قریب آتے ہی اس کے دوپٹے کو اپنے دائیں ہاتھ کی ٹیڑی انگلی پہ لپیٹتے ہوئے کہا

" ذرا دھیان سے کہیں نظر نہ لگ جائے۔

"آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کیسے نظر لگ سکتی ہے"۔ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اس نے باہر جانے کے لیے اپنا رخ تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ اسلم نے اس کے دوپٹے کو کھینچا اور وہ " اوئی" کہہ کر دوپٹے کے بلوں سے آزاد ہو گئی۔ اسلم نے زمین پر پڑے ہوئے دوپٹے کو مسکراتے ہوئے اسے پکڑایا۔ زرینہ نے دوپٹے کو پکڑتے ہی مسکرا کر "شکریہ" کہا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

اسلم اپنے خیالوں کی دنیا میں کھو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ زرینہ اس کے اس قدر قریب کیوں ہو رہی ہے وہ یہ بھی اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اس کے والدین کا غم دور کرنے کے لیے زرینہ کی شوخیاں کافی ہیں مگر پھر بھی اسلم اپنی اس حرکت پہ بڑا نادم تھا اور چاہتا تھا کہ زرینہ سے اس کی معافی مانگ لے۔ وہ ابھی کوئی فیصلہ نہ کرنے پایا تھا کہ زرینہ ایک بار پھر اس کے کمرے میں داخل

ہوئی۔ اس کا دوپٹہ اس کے سر سے سرک کر اس کی گردن کے ساتھ لپٹا ہوا تھا اس کے ہاتھ میں شیشے کا ایک گلاس تھا جو اوپر اور نیچے دو پلیٹوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ زرینہ ایک ہاتھ سے نیچے کی پلیٹ کو پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے اوپر کی پلیٹ کو تھامے آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اسلم اسے متواتر ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ جونہی وہ قریب آئی اسلم نے بایاں ہاتھ اس کی طرف دراز کرتے ہوئے کہا "یہ کیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

زرینہ نے کروٹ بدلتے ہوئے جواب دیا یہ ہے جناب وہ دودھ جو آپ پیئے بغیر ہی چلے گئے تھے یہ کہتے ہوئے زرینہ نے مسکرا کر گلاس اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا جسے پکڑتے ہی اسلم نے اُف ۔ ۔ ۔ اُف کے ساتھ عجیب و غریب اداکاری کر کے گلاس کو میز پر رکھنے کی کوشش کی مگر اس کے دوسرے ہاتھ کے لگنے سے گلاس زمین پر گر کر ٹوٹ گیا اور تمام دودھ ضائع ہو گیا۔ دودھ کے گرم ہونے کی وجہ سے گلاس سخت گرم ہو چکا تھا۔ اسلم ابھی تک اپنے دونوں ہاتھوں کو پھونکیں مار کر ہاتھ کی جلن کو ٹھنڈک پہنچا رہا تھا۔ زرینہ اسے دیکھ کر متواتر زوردار قہقہے لگا کر اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔

"تم بہت وہ ہو گئی ہے ہو زرینہ"۔ اسلم نے اپنے چہرے پر غصے کے مصنوعی آثار جمع کرتے ہوئے کہا۔

یہ سنتے ہی زرینہ نے اور زور سے قہقہے لگانے شروع کر دیئے اور قریب

آ کر جلدی سے اسلم کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا

"لایئے میں آپ کا ہاتھ دبادوں"

جوں جوں وہ مسکرا رہی تھی اس کے رخساروں پر سرخی بڑھتی جا رہی تھی اسلم نے پہلے تو اس کے چہرے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھا اور پھر اس کی شربتی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا

"نہیں نہیں کہیں ہاتھ دباتے دباتے کوئی سوئی نہ چبھو دینا" اور اس کے ساتھ ہی اس نے ایک ہی جھٹکے سے اپنے ہاتھوں کو اس کی گرفت سے آزاد کراتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھوں کو آہستہ آہستہ دبانا شروع کر دیا زرینہ مسکراتی رہی اس کے رخسار سرخ ہوتے گئے۔ زرینہ کو مسکراتا دیکھ کر اسلم نے بھی مسکرانا شروع کر دیا۔ جب کچھ نہ بن پڑا تو اسی فقرے پر قناعت کی۔

"زرینہ تمہارے ہاتھ بہت نرم ہیں۔" "جی ہاں! انہیں نرم ہی رہنا چاہیئے"

"اور تمہاری آنکھیں بڑی شربتی ہیں"

"یہ روزانہ شربت جو پیتی ہیں"

"تمہارے رخسار سیب کی مانند سرخ کیوں ہو رہے ہیں؟"

"آپ کے رخسار جو زرد ہو رہے ہیں اس لیے آپ کے چہرے کی سرخی میرے چہرے پہ رونما ہو گئی ہے"

"مگر میرا چہرہ تو بڑا سرخ ہے"

"اچھا عقلمند کو تو ایک اشارہ کافی ہوتا ہے۔ سمجھ لیجئے یہ سرخی میں نے سیبوں سے ادھار مانگ رکھی ہے"۔

یہ کہتے ہوئے زرینہ مسکرا دی اس کے رخساروں کی سرخی میں اور اضافہ ہوگیا اسلم نے اس گفتگو کو ختم کرنے کے لیے پوری قوت سے اس کا ہاتھ دبا کر چھوڑ دیا۔ وہ ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ اوئی اللہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ دبانا شروع کر دیا۔ اسلم اسے یوں خاموشی سے ہاتھ دباتے دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑا زرینہ نے اسے منہ چڑاتے ہوئے کہا

"چلو یہ بھی اچھا ہوا جو آپ نے کسی نہ کسی طرح بدلہ تو لے لیا"

" اسلم نے اٹھ کر آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا "معاف کر دینا زرینہ" زرینہ نے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے کہا

"بس اتنی سی بات سے گھبرا گئے"۔

زرینہ نے فرش پر بکھرے ہوئے گلاس کے ٹکڑوں کو سمیٹنے کی کوشش کی مگر اسلم نے جلدی سے تمام ٹکڑے اٹھاتے ہوئے کہا" رہنے دیجئے میں خود اٹھا لوں گا "آپ کے نازک ہاتھ ایک گلاس نہ سنبھال سکے وہ اتنے بڑے ٹکڑے کیسے سنبھالیں گے"۔ زرینہ نے طنزیہ کہا

"اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تمہیں سمیٹنے چاہئیں" یہ کہہ کر اسلم نے بے دردی کے ساتھ ان ٹکڑوں کو دوبارہ فرش پر پھینک دیا اور خود پلنگ پر لیٹ کر

اخبار کا مطالعہ شروع کر دیا۔ جب زرینہ ان ٹکڑوں کو باہر کوڑے کرکٹ میں پھینک کر واپس آئی اس کے ہاتھ میں ایک جھاڑو اور دوسرے ہاتھ میں پانی کا ایک برتن تھا جس سے وہ فرش پر گرے ہوئے دودھ کو صاف کرنا چاہتی تھی۔ جونہی وہ فرش کو دودھ سے صاف کرنے کے لیے نیچے بیٹھی اسلم نے اسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا

"میں نے کہا کہیں ان ٹکڑوں کو اکٹھا کرتے ہوئے اپنا ہاتھ نہ زخمی کر لینا"

"بہت اچھا ڈاکٹر صاحب" یہ کہتے ہوئے زرینہ نے فرش پر پانی بہاتے ہوئے کچھ اس طرح سے جھاڑو دیا کہ تقریباً ساری چھینٹیں اسلم کے چہرے پر پڑیں۔ اسلم نے اٹھ کر تولیے سے چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا

"توبہ ان عورتوں سے تو خدا ہی بچائے"

زرینہ جلدی سے فرش صاف کر کے کمرے سے باہر چلی گئی اور اسلم پھر اپنے خیالوں میں کھو گیا۔

پانچواں باب

زرینہ کے چلے جانے کے بعد اسلم دوبارہ پلنگ پر لیٹ گیا۔ اچانک اس کی ماضی کی تاریخ کے اوراق الٹ گئے۔ وہ رات گئے تک ماضی کے بھیانک مناظر دیکھتا رہا اور گھبرا کر کروٹ بدلتے ہوئے کہنے لگا کہ قدرت بھی کتنی ظریف ہے پہلے مجھے اپنا مستقبل کتنا درخشاں نظر آتا تھا۔ میرے سامنے کتنے بڑے بڑے منصوبے تھے کتنی عجیب وغریب زندگی گزر رہی تھی اور نہ کسی کا خیال نہ کوئی فکر وغم۔ لاہور کبھی خواب میں بھی دکھائی نہ دیا تھا۔ البتہ لندن دیکھنے کے ہر وقت خیال ستایا کرتے تھے۔ مگر قدرت نے لندن کے خیالات سے چھٹکارا دلایا تو لاہور دکھلا دیا۔ مجھ سے ماں باپ جدا کئے تو کس طریقے سے ایک اور مصیبت مجھ پر لا بٹھائی ایک درخشاں مستقبل مجھ سے چھینا تو کس طرح حسن امتیاز سے ایک اور مستقبل کو میرے لیے دشمن بنا دیا۔ بڑی دیر سے زرینہ کی چاہت کے ارمان سینے میں سلگ رہے تھے

آج ان کے بیٹے بھی تو نے کس طرح میرے لیے راستہ صاف کر دیا، پہلے مستقبل کی خواہش تو اب ایک مرجھائے ہوئے پھول کی طرح دیکھنے سے رہی.... اس لیے ہردم یہی دعا ہے کہ کم ازکم اس مستقبل کو دیکھنے کے لیے میری آنکھوں کو نہ ترسنا پڑے۔ مجھے یقینِ کامل ہے اور امید واثق ہے کہ زرینہ کے والدین بھی ہمارے ملاپ کو اسی دل سے چاہیں گے جس دل سے زرینہ مجھے چاہتی ہے اور میں زرینہ کو چاہتا ہوں۔

دن گزرتے رہے راتیں بڑھتی رہیں اور ان کی محبت کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی۔ اس عرصہ میں انہیں اپنی محبت کو اوج پر پہنچانے کے لیے کئی مواقع ملے۔ پہلے وہ سب اکھٹے بیٹھ کر کھانا کھایا کرتے تھے مگر جب اسلم کو یہ معلوم ہوا کہ زرینہ کے والدین خود یہ چاہتے ہیں کہ یہ آپس میں خوب عشق کی پینگیں بڑھا لیں تاکہ مستقبل قریب میں ان کی شادی کر دی جائے۔ تو اس نے اپنے کمرے میں اکیلے کھانا کھانے کا معمول بنا لیا۔ جونہی اسلم کو کھانے کی میز پر موجود نہ پایا شیخ انتظار حسین فوراً زرینہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے "بیٹی زرینہ! اسلم میاں اپنے کمرے میں کام میں مشغول ہوں گے ممکن ہے انہیں آتے میں دیر لگ جائے اس لیے کھانا ان کے کمرے میں ہی پہنچا دو"

یہی حساب اس کی والدہ کا تھا جو معمولی معمولی کام کے لیے زرینہ کو اسلم

کے پاس بھیجتی تھی چنانچہ اپنے ماں باپ کی اس فراغ دلی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زرینہ اپنا اکثر وقت اسلم کے کمرے میں اس کے ساتھ باتیں کرنے میں گزارتی تھی۔

ایک دن اسلم اپنے کمرے میں بیٹھا بڑی سنجیدگی سے ایک ناول پڑھ رہا تھا۔ جس میں ناکام محبت کی نہایت عبرتناک اور افسوس کن کہانی تشریحاً و صریحاً بتائی گئی تھی۔ اسلم یہ پڑھتے ہی فوراً ٹھٹھک کے رہ گیا۔ اور اس نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ محبت کتنی بری چیز ہے۔ اس قسم کے ناول اس نے اپنی کالج کی زندگی میں بہت پڑھے تھے۔ مگر کسی بھی ناول سے اس کی طبیعت پر ذرہ بھر بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد اس نے اپنے دل کو تسلی دیتے ہوئے کہا

"نہیں .... نہیں .... میری محبت ضرور کامیاب محبت ہوگی۔" وہ ابھی انہیں خیالات میں گم سم بیٹھا ہوا تھا کہ زرینہ کی شوخیانہ چال، ڈھال، رفتار اور گفتار نے اسے چونکا دیا اس کے دائیں ہاتھ میں ایک لفافہ تھا جس میں پاؤ بھر کے قریب مٹھائی تھی۔ آج اس کے رخسار غضب کے سرخ ہو رہے تھے۔ اس کے لبوں پر اس سے پہلے اتنی دلکش مسکراہٹ کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آنکھوں کی صراحی میں خمار آلود مستی کو کوٹ کوٹ کر بھر دیا گیا تھا۔

زرینہ کمرے میں داخل ہوتے ہی اسلم کے قریب لفافے کو میز پر رکھ کر خود ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور بڑی سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

"آپ میری طرف دیکھ کر اتنے متعجب کیوں ہو رہے ہیں یہاں بیٹھے ہوئے کہیں آج آپ اپنی ماضی کی تاریخ کو تو نہیں دوہرا رہے تھے"۔

"بس جو کچھ تم سمجھ لو وہی ٹھیک ہے" اسلم نے کرسی کی پیٹھ پر ٹیک لگاتے ہوئے کہا

" ہر انسان کا ماضی تاریک ہوتا ہے اور پھر تمہیں تو اپنے مستقبل کی فکر کرنی چاہیئے"

"مستقبل کا نام سنتے ہی میرے دل پر ٹھیس سی لگتی ہے خدا جانے کیوں"

" پھر تو آپ کا سینہ ضرور زخموں سے چھلنی ہو گا"۔

"کیا آج کل علم نجوم تو نہیں پڑھنا شروع کر رکھا ہے؟" اسلم نے مسکراتے ہوئے کہا "معلوم نہیں ایک علم تو ضرور پڑھنا شروع کر رکھا ہے جس کا سبق یاد ہوتا ہے اور نہ ہی ختم ہونے کا نام لیتا ہے"۔

"اچھا بڑی خوشی کی بات ہے مگر اُستادی کا شرف کس خوش نصیب کو حاصل ہے"

"ایک لڑکے کو جو ابھی تک بیچارا کنوارہ ہی ہے"۔

"زرینہ! دعا مانگو وہ قیامت تک کنوارہ ہی رہے!"

"دعا مانگنے میں تو مجھے کوئی بخل نہیں مگر سوچتی ہوں کہ پھر تو مجھے بھی یقینی طور پر قیامت تک کنواری ہی رہنا پڑیگا۔"

"زرینہ! آج میری طبیعت بہت اُداس ہے۔"

"جی! اس لیے تو میں آپ کی طبیعت کو بہلانے کے لیے آگئی ہوں۔"

"آخر تم کیا پوچھنے کے لیے آئی ہو زرینہ!" اسلم نے ذرا سختی سے کہا

"میں یہ پوچھنے کے لیے آئی ہوں کہ حضور المرتب یعنی کہ جنابِ والا ذی شان نے کسی کو دل تو نہیں دے رکھا اگر دے رکھا ہے تو اب بھی بتا دیجئے کیوں کہ ابھی وقت ہے۔"

"زرینہ! جس کالج میں پڑھا کرتا تھا وہاں ہر جماعت دوسرے شہروں سے آیا ہُوا تھا اس لیے وہ اپنے آپ کو آزاد سمجھتے ہوئے کالج کے اردگرد رہنے والی لڑکیوں کو بڑی اچھی طرح اپنی محبت کا لقمہ بناتے ہوئے مجھ سے پوچھا کرتے تھے کہ تمہارے عشق کا کیا حال ہے تو میں انہیں جواب دیتا کہ میں عشق کرنے کی بجائے عشقیہ ناول پڑھنے کا شوقین ہوں مگر زندگی کے حادثات میں اب ایک شوخ وشنگ لڑکی نے میرے دل کو چرا کر زبردستی مجھے اپنی محبت میں گرفتار کر لیا ہے"

"اتنی بڑی فصیح وبلیغ تقریر کرنے کی بجائے صرف یہی کہہ دیتے تو کافی تھا

کہ میں اس لڑکی سے محبت کرتا ہوں جو اس وقت یہاں بیٹھی ہوئی ہے"۔

"چلو ایسے ہی سہی مگر اب یہ سوچتا ہوں کہ کاش یہ محبت نہ ہوتی"۔

"اجی! کیا کہا اور کیوں کہا" زرینہ ایک دم چونک اٹھی۔

اسلم نے کرسی سے اٹھ کر اس کے گرد گھومتے ہوئے جواب دیا "اس دنیا میں ہر دکھ اور پھر ہر جدوجہد کے بعد راحت اور آرام نصیب ہوتا ہے۔ مگر محبت ایک ایسی دنیا ہے جس کے آغاز میں جھجک، ابتدا میں خلوص و پیہم مگر درمیان میں دکھ، مصیبتیں اور زبردست تکلیفیں اور آخر میں خودکشی یا موت سے تعبیر ہوتی ہے"۔

یہ سنتے ہی زرینہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور لفافے کو پکڑتے ہوئے کہا "بڑی دور کی سوچتے ہیں آپ بھی ہماری محبت ایسی محبت نہیں جس کو ادیب ہیر رانجھا، سسی پنوں اور سوہنی مہینوال کے عنوان سے لکھیں گے۔ اگر ہماری محبت پر کسی ادیب نے قلم اٹھایا تو اس کتاب کا نام "زرینہ" ہوگا اور وہ سوہنی مہینوال، ہیر رانجھا کے قصوں سے بالکل الگ ہوگی۔ میں آج خالہ جان کے ہاں گئی تھی وہاں سے ایک اڑتی ہوئی خبر لائی ہوں اور وہ یہ ہے کہ ہم دونوں عنقریب ایک اور نیک ہو رہے ہیں یعنی کہ ہماری شادی اور خانہ آبادی کے مشورے ہو رہے ہیں۔ اس لیے واپسی پر بازار سے لڈو بھی لے آئی تاکہ آپ کی محبت کی پہلی کامیابی پر آپ کا منہ بھی میٹھا کرا سکوں"۔

اس اثنا میں اسلم دوبارہ کرسی پر بیٹھ چکا تھا اور اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ زرینہ نے جلدی سے ایک لڈو پکڑ کر اس کے منہ میں

گھسیٹ دیا اور خود دوڑ کر قہقہے لگاتی دروازے پر کھڑی ہو گئی۔

چھٹا باب

اسلم بہت خوش تھا کہ چلو اپنے دل میں جو پہلی اور آخری خواہش ہے وہ اب بہ آسانی پوری ہو ہی جائیگی۔ ایک رات وہ بارہ بجے سینما دیکھ کر گھر لوٹا تو اس کا استقبال زرینہ کی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آنکھوں نے کیا۔ اسلم فوراً ٹھٹھک کے رہ گیا کہ اب، کوئی اور ہی مصیبت آپہنچی ہے زرینہ نے ہچکی لے کر اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا میں آج رات سونے کے لیے جب بجلی کا بٹن دبانے اٹھی تو یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ساتھ والے کمرے سے کچھ آواز آرہی ہے میں فوراً باہر آئی اور کھڑکی سے کان لگاتے ہوئے سننے کی کوشش کی یہ سن کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی کہ اماں جان کو ابا میاں سے کچھ اختلاف سا ہے"۔

یہ کہتے ہوئے زرینہ کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو ٹپکے جو اس کی گالوں سے ہوتے ہوئے چھاتی کے ساتھ مندمل ہو گئے۔ یہ سن کر اسلم بھی بہت مایوس ہوا۔ اس کا چہرہ جو ابھی ابھی ہشاش بشاش تھا اب اس پھول کی

مانند مرجھا گیا جیسے سورج کی گرمی پہنچنے سے پہلے زمین کی تپش پہنچ گئی ہو۔

آج سے چند ہی روز پیشتر اسی کمرے میں دو مسکراتے ہوئے چہروں نے اپنی شادی کے عہد و پیمان باندھے تھے۔ ایک خوش آیند خبر سن کر انہوں نے اپنے درخشاں مستقبل کو سنوارا تھا۔ اس وقت انہیں یہ گھر جنّت سے زیادہ خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ مگر آج اسی کمرے میں دو پژمردہ چہرے یہ سوچ رہے تھے کہ ہم جائیں تو جائیں کہاں ——————————

چند ساعت کی خاموشی کے بعد اسلم نے جھپکتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا "آخر وہ کیا کہہ رہے تھے .... اور وہ کیا چاہتے ہیں ؟" زرینہ نے ایک منٹ بھی سوچنے کے بغیر جو کچھ اس نے سنا تھا اسلم سے ان لفظوں میں حرف بہ حرف کہہ دیا۔

زینت :۔ میرے خیال میں اب ہمیں زرینہ کی شادی کی فکر کرنا چاہیئے۔

شیخ انتظار حسین :۔ ہاں ! میں بھی اسی خیال کا حامی ہوں مگر سوچتا ہوں کہ انتظار کی باقی ماندہ گھڑیاں بھی تو ختم ہو لیں۔

زینت :۔ خیر یہ انتظار کی گھڑیاں تو ختم ہوتی ہی رہیں گی پہلے تو ہمیں یہ سوچنا ہے کہ زرینہ کا ہاتھ کس کے ہاتھ میں پکڑا دیا جائے۔

انتظار حسین :۔ جس کسی کے ہاتھ کی قسمت کی لکریں زرینہ کی تقدیر سے مل جائیں گی اسی کے ہاتھ میں زرینہ کا ہاتھ دے دیا جائے گا۔

زینت :۔ یہ تو شروع سے ہی ہوتا چلا آرہا ہے مگر پھر بھی ہمیں سب سے پہلے اسی گتھی کو سلجھانا پڑیگا زرینہ کے ابا !

انتظار حسین :۔ بیگم لڑکی تو ہماری ہے ہی اور لڑکا بھی تقریباً تقریباً......

زینت :۔ (بات کاٹتے ہوئے) .... ہمارا ہی ہے۔

انتظار حسین :۔ زرینہ کی اماں ! اسلم میاں ہمارے لیے قدرت کا دیا ہوا ایک تحفہ ہے اس کا اچانک ہمارے ہاں آنا ہمارا اچانک ہی اس کی کار میں سفر اختیار کرنا۔ راستے میں اچانک ہی سکھوں کا زرینہ کو اُٹھا کر لے جانا۔ اسلم کے دل میں اچانک ہی کچھ خیال آنا اور اس کا اچانک ہی زرینہ کو سکھوں کے جنگل سے چھوڑا کر لے آنا۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں جو میرے اس بیان کی سوا سولہ آنے پوری تائید کرتی ہیں۔ میں یہ انتظار کر رہا ہوں کہ وہ دن جلد ہی آئے جب اسلم کے والدین اسے ملیں تاکہ وہ بھی اس خوشی میں برابر کے شریک ہو جائیں۔

زینت :۔ اب میں سمجھی کہ آپ کا نام کسی نے انتظار حسین کیوں تجویز کیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ آپ کو ہر وقت کسی نہ کسی کا انتظار ہی لاحق رہتا ہے۔ آپ نے کبھی یہ سوچنے کی کوشش کی کہ مرے مرنے بھی جیتے ہیں کبھی !

انتظار حسین :۔ اسلم میاں نے انہیں ڈھونڈنے کی کوشش تو بہت کی تھی مگر افسوس ! معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی سکھ بربریت کے ہاتھوں قتل ہو

چکے ہیں۔ اس لیے اب ہمیں وقت کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے اسلم کے سر پہ شفقت کا ہاتھ پھیر کر دو بول پڑھا دینے چاہئیں۔

زینت :۔ یہ تو ٹھیک ہے مگر ہم اس کے والدین سے لیکر اس کی برادری کے کسی بھی فرد کو نہیں جانتے۔ ہم کیا جانیں اس کی ذات کیا ہے۔

انتظار حسین :۔ مگر ہمیں ذات پات میں تمیز کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟

زینت :۔ منگنی کے وقت یہی چیز سب سے پہلے سوچی جاتی ہے۔

انتظار حسین :۔ خیر یہ تو میں نے دو ٹوک فیصلہ کیا ہوا ہے کہ اسلم کی شادی زرینہ سے ہی کی جائے گی مگر میں یہ سوچتا ہوں کہ اسلم نے تمام شہروں کا پتا پتا تو چھان مارا لیکن کراچی کی طرف کبھی نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ کراچی ایک بہت بڑا شہر ہے جہاں مہاجرین کی آبادی دو لاکھ کے قریب بتائی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے اسلم کے والدین اپنے رشتہ داروں کے ساتھ کراچی میں سکونت پذیر ہوں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اسلم کے والد کا شمار دہلی کے چوٹی کے تاجروں میں ہوتا تھا اور تاجر ہمیشہ تجارتی شہر میں پناہ لیتا ہے اس لیے ہمیں اسلم کو آخری کوشش کے لیے کراچی ضرور بھیجنا چاہیئے۔

زینت :۔ ہاں ہاں! اس میں کیا حرج ہے اتنی دیر میں ہمیں مزید کچھ سوچنے کے لیے وقت بھی مل جائے گا۔

انتظار حسین :۔ تو پھر مجھے کل صبح اسلم کو پہلی گاڑی ہی میں کراچی روانہ کر

دینا چاہیئے۔

جب زرینہ یہ سب کچھ کہہ کر خاموش ہو گئی تو کچھ وقت کے لیے وہ دونوں سوچ وفکر کی گہرائیوں میں ڈوب گئے۔ ان کی آنکھوں سے نیند اس طرح غائب تھی جیسے گدھے کے سر سے سینگ غائب ہوتے ہیں کافی دیر تک وہ دونوں ایک دوسرے کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ زرینہ نے اپنی پھڑکتی ہوئی نظروں سے سارے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے نظروں کو گھمایا۔ جب وہ کمرے کو اچھی طرح دیکھ چکی تو اس نے اپنی آنکھیں اسلم کی آنکھوں میں پیوست کرتے ہوئے کہا۔

"میرے خیال میں ہماری محبت کی چٹان کو پاش پاش کرنیوالا پہلا طوفان ہے جس کے آثار شروع میں بہت معمولی نظر آتے ہیں مگر آخر میں۔۔۔۔۔

زرینہ ابھی اپنی بات پوری نہ کرنے پائی تھی کہ اسلم نے بات کاٹتے ہوئے جواب دیا "تم ٹھیک کہتی ہو زرینہ۔۔۔۔۔۔ تم ٹھیک کہتی ہو"۔

"مگر اب میں سوچنے کی کوشش کرتی ہوں تو سوچ نہیں سکتی۔ کچھ کہنے کے لیے زبان کھولتی ہوں تو طاقت گویائی نہیں رکھتی کہ آخر اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ کیا ہم ہمیشہ کے لیے جدا کر دیئے جائیں گے؟"

"زرینہ! ہمارے لیے سب سے بڑی مشکل تو یہ ہے کہ عورت، مرد سے ہر قیمت پر اپنی بات منوالیا کرتی ہے اب اگر تمہاری والدہ ہمیں اکٹھا

دیکھ کر اپنی طبیعت پہ ایک بوجھ سا محسوس کرتی ہیں تو پھر ہمیں یقیناً ہمیشہ کے لیئے جدا کر دیا جائے گا۔"

"اگر اماں جان ایک عورت ہوتے ہوئے اپنی بات منوا سکتی ہیں تو کیا میں بھی ایک عورت ہوتے ہوئے اپنی بات نہیں منوا سکتی۔"

"تم عورت کہاں بلکہ تم تو ایک لڑکی ہو البتہ تم عورت بننے کے لیئے ہاتھ پیر ضرور مار رہی ہو۔" "تو اس کا یہ مطلب ہے کہ مجھے اب وقت سے پہلے ہی عورت بننا پڑے گا؟"

"زرینہ"! یہ تو سب معمولی باتیں تھیں۔ دراصل ہر محبت قربانی مانگا کرتی ہے میں نہیں سمجھتا تھا کہ ہماری محبت کو بھی قربانی کی ضرورت ہے۔ اس لیے میں تم کو کہوں گا کہ ابھی جا کر اپنے کمرے میں یہ سوچ لو کہ کیا تمہیں اپنی زندگی کے لیے میرے سہارے کی ضرورت ہے؟ میری خاطر اپنی زندگی کو جان جوکھوں میں نہ ڈالنا کیوں کہ میں نے تمہیں دکھوں سے اس لیے نہیں چھٹکارا دلایا تھا کہ میری خاطر تمہاری زندگی اجیرن ہو جائے اور تمہیں گرہستی کے جیل خانے کی سلاخوں میں دوبارہ قید کر دیا جائے میں کراچی جاؤں گا ہو سکتا ہے قدرت کو کچھ اور ہی منظور ہو اور اسی بہانے میرے والدین پینے سے آلگیں۔"

ساتواں باب

دوسرے دن صبح اسلم بستر پر لیٹ کر اخبار پڑھ رہا تھا کہ شیخ انتظار حسین کمرے میں داخل ہوئے اور ایک کرسی کو کھینچتے ہوئے اس کے بستر کے قریب بیٹھ گئے اتنے میں اسلم بھی بستر پہ ٹھیک ہو کر بیٹھ گیا۔ کافی دیر تک وہ ملکی سیاست پر تنقید و تبصرہ کرتے رہے۔ بالآخر شیخ انتظار حسین اپنے مطلب کی طرف آئے۔ زرینہ چائے کا ایک ٹرے لیکر کمرے میں داخل ہوئی جسے دیکھتے ہی شیخ انتظار حسین نے پاس پڑی ہوئی میز کو اپنی طرف سرکایا۔ اسلم نے میز پر پڑی ہوئی دو کتابوں کو اٹھا کر تکیئے کے نیچے رکھتے ہوئے میز پوش کو درست کیا۔ زرینہ نے میز پر ٹرے رکھا اور ایک نظر سے دونوں کو دیکھ کر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئی۔ شیخ انتظار حسین اس وقت تک زرینہ کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے جب تک برآمدے سے اس کے پاؤں کی آہٹ کی

آواز آتی رہی اور اس کے بعد پیالیوں میں چائے ڈالتے ہوئے اسلم سے یوں فرمانے لگے :۔

"اسلم میاں ! میں آج تمہیں ایک بات بتانے کے لیے آیا تھا اور وہ یہ ہے ہم چاہتے ہیں کہ تمہاری اور زرینہ کی خوشی دیکھ لیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے دل میں یہ خواہش بھی چٹکیاں لے رہی ہے کہ اس خوشی میں تمہارے والدین بھی برابر کے شریک ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تم نے والدین کی تلاش میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مگر پھر بھی کراچی شہر تمہاری تمام تر کاوشوں سے باہر رہا۔ اس لیے اب تم اپنا ضروری سامان سمیٹ کر کراچی روانہ ہو جاؤ۔ ہماری دعائیں ہر وقت تمہارے ساتھ رہیں گی۔ مجھے یقینِ کامل ہے کہ اس مرتبہ قدرت تمہارا ضرور ساتھ دے گی۔ جاؤ اور تیاری مکمل کر لو"۔

یہ کہتے ہوئے شیخ انتظار حسین اٹھے اسلم سے مصافحہ کر کے باہر نکل گئے۔

اسلم یہ سب کچھ پہلے سے ہی جانتا تھا اس لیے ان کے جانے کے بعد اس نے جلدی سے ضروری سامانِ سفر باندھنا شروع کیا۔ اس دن اتوار تھا۔ صبح کا کھانا سب نے ایک ہی جگہ بیٹھ کر تناول کیا۔ گاڑی کو نو بج کر پندرہ منٹ پر روانہ ہونا تھا۔ اسلم نے اپنی کلائی اوپر اٹھاتے ہوئے گھڑی سے ٹائم دیکھا تو دو بجا چاہتے تھے۔ چنانچہ اسلم نے جانے

کے لیئے اجازت چاہی۔ شیخ انتظار حسین نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "جاؤ بیٹا! خدا تمہارا حامی و ناصر ہو"

جب اسلم کراچی جا رہا تھا تو اس کا دل بالکل مطمئن تھا کیونکہ اسے ایک طرف یہ امید تھی کہ اگر اس کے والدین زندہ ہیں تو ان کا کراچی میں ضرور کوئی نہ کوئی سراغ مل جائے گا۔ اور دوسری طرف اسے یہ یقین تھا کہ شیخ انتظار حسین کی ہمدردی اور حمایت ان کی محبت کی گل کاریوں کو پامال ہونے سے بچائیگی۔ کراچی میں اسلم نے "پارک ہوٹل" میں سکونت اختیار کی۔ شہر کے مشہور اخبارات میں اپنی فوٹو کے ساتھ اشتہارات چھپوائے۔ دریں اثناء ایک ہفتہ گذر گیا۔ مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اسلم نے شہر کے ہر بازار، محلے محلے، گلی گلی اور کوچے کوچے میں شب و روز گشت لگا کر انہیں ڈھونڈنے کی بڑی تندہی سے کوشش کی۔ وہاں اسے کئی جان پہچان والے ملے جنہوں نے اس کے والدین کے متعلق کسی بھی واقفیت سے اپنے آپ کو بے بہرہ ظاہر کیا۔ تقریباً بیس بائیس روز کی تگ و دو کے بعد ناکامی سے دوچار ہوتے ہوئے اسلم پریشانی کے عالم میں پارک ہوٹل" کے بڑے دروازے کے قریب بجلی کے ایک کھمبے کے ساتھ ٹیک لگائے نہ جانے کس خیال میں غرق تھا کہ اسے ایک ہاکر کی چلاتی ہوئی آواز نے چونکا دیا........."آگیا.....آگیا......

مجید لاہوری کا نمکدان آگیا" اسلم نے پہلے تو اسے گھورتے ہوئے اپنے سامنے سے گزر جانے دیا۔ جب وہ تھوڑی دور آگے بڑھ گیا تو اسلم اس کی طرف بدستور گھورتے ہوئے بولا "یہ کیا ہے"۔

"مجید لاہوری کا نمکدان"......" ہاکر نے بلند آواز سے کہا

"نمکدان! آخر وہ کیا ہوتا ہے" اسلم نے یونہی بے سوچے سمجھے سوال کرتے ہوئے کہا

"مجید لاہوری کا نمکدان پندرہ روزہ اخبار ہے۔ بس چار آنے دیجئے اور کام اپنا کیجئے"۔" اسلم نے تھوڑے سے تفکر کے بعد جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر ہاکر کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

"نوٹ.............. دس روپے کا"

بابو جی! وہ وقت گیا جب اس طرح کے چھ نوٹ مجھے ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو اپنے سیٹھ ایس۔ ایم۔ اشرف سے ملا کرتے تھے"۔ ہاکر نے نوٹ کے ساتھ اپنی ہتھیلی کو ملتے ہوئے طنزیہ کہا

"تم کس جگہ کی باتیں کر رہے ہو"

"اجی! بابو جی نئی دہلی کی"

"تم ٹھیک کہتے ہو میں نے تمہیں وہاں دیکھا تھا۔ تمہارا نام حمید تو نہیں؟

.........." اور تمہارا نام بابو اسلم تو نہیں؟"

"اجی! کہتے تو لوگ مجھے کچھ ایسا ہی ہیں"

"تو دیکھئے بابو اسلم آپ نے مجھے پہچانا تک نہیں۔ حالانکہ میں نے اپنی تمام عمر سیٹھ صاحب کے گوداموں کی نگہبانی میں صرف کردی تھی۔

"سب سے پہلے میں نے ہی تو تمہیں پہچانا ہے ورنہ یونہی تو آواز نہیں دی تھی۔" "اچھا بابو صاحب! آپ یہ بتائیے کہ یہاں کیسے پہنچے۔ سیٹھ صاحب کو آپ کی بڑی فکر رہتی تھی۔"

جس طرح قدرت نے تمہیں یہاں تک پہنچا دیا اسی طرح میں بھی ہزاروں مشکلات سے کھیلتا ہوا یہاں تک آ پہنچا۔"

اسلم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اس کے چہرے پر ایک عجیب قسم کا تبسم طاری تھا اس کی آنکھیں باپ کے چہرے کو ترس رہی تھیں۔ اس کی پیشانی ماں کی ممتا کے بوسے کے لیے سرخ ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے بدن میں چستی آچکی تھی۔ اس کے خیالات بدل چکے تھے اور اس کے دل کی گہرائیوں میں یاس و قنوط کی گھٹاؤں کا اندھیرا چھٹ چکا تھا۔

"مجھے سیٹھ صاحب کے پاس لے چلو حمید میاں"

"مگر وہ ایسی جگہ جا چکے ہیں جہاں میں تمہیں نہیں لے جا سکتا۔"

"یہ کہتے ہوئے حمید کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر چکی تھیں۔

کیا کہا! میں کچھ نہیں سمجھ سکا۔" اسلم نے گھبراتے ہوئے کہا

"اسلم! وہ اب تمہیں کبھی نہیں مل سکیں گے"۔ حمید کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"کیا مطلب! وہ میرا انتظار کرنے کے بعد مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے"۔

"اسلم! تمہارے کالج جانے کے بعد دہلی میں ہندو مسلم فرقہ وارانہ فسادات گرم ہوئے۔ ہندوستان تقسیم ہو گیا۔ اکثریت اقلیت پر غالب آگئی ہم پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے ہر طرف آزادی کی آگ پھیل گئی۔ ہندوؤں اور سکھوں نے اپنے متحدہ گٹھ جوڑ سے مسلمانوں کے گھروں کو نذر آتش کر دیا۔ جب تک تم نہ آئے سیٹھ صاحب اسلم... اسلم پکارتے رہے۔ ایک منحوس رات تمہاری بلڈنگوں کو آگ لگ گئی۔ صبح کو جب ہم سب مسلمان آپ کی بلڈنگ کے اوپر گئے تو دیکھا کہ سب اہل خانہ جل کر خاک ہو چکے ہیں سیٹھ صاحب ایک فرش پر پڑے ہوئے تھے ان کے ایک ہاتھ میں تصویر تھی جو انہوں نے اپنے جلے ہوئے سینے کے ساتھ لگائی ہوئی تھی۔ وہ فوٹو جل چکی تھی مگر اس کے نچلے حصے پر آگ نے اپنا اثر نہیں دکھلایا تھا۔ اس حصے میں روشنائی سے موٹے حروف میں لکھا ہوا تھا اسلم۔

اسلم کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اس کا سارا جسم اس سانحۂ عظیم سے کانپ رہا تھا اس کی آنکھوں سے یوں اشک رواں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خوف و ہراس اپنے پوشیدہ

پنجوں سے اس کے رخساروں پر تھپڑ رسید کر رہے ہیں اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے "نمکدان" زمین پر گر پڑا اور وہ نظریں زمین پر گڑائے آنسو بہاتا "پارک ہوٹل" کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر حمید کی آنکھیں بھی آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکیں اس کی آنکھوں کے گرد قیامتِ صغرایٰ کے وہ دل خراش واقعات گھوم گئے جن کے مجموعہ کو انقلاب ۱۹۴۷ء کہتے ہیں۔ حمید بھی اسلم کے پیچھے پیچھے اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اسلم زاروقطار رو رہا تھا۔ حمید کافی عرصہ اسے روتا دیکھ کر بت بن کر کھڑا رہا۔ جب وہ کھڑا رہ کر تھک گیا تو اس نے اسلم کو دلاسا دیتے ہوئے کہا

"بابو اسلم! صبر کرو قدرت کو ایسا ہی منظور تھا۔"

"صبر کیسے کروں میرا اس دنیا میں کوئی نہیں رہا۔" اسلم نے روتے ہوئے جواب دیا۔

"جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا بھی خدا ہوتا ہے۔" حمید نے اپنے رومال سے اسلم کی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا

اسلم نے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آنکھوں کو اوپر اٹھاتے ہوئے جواب دیا

سہ آج ہے غم کا مزا دل بھر کے رونے دیجئے
آستیں کا ذکر کیا دامن بھگونے دیجئے

آٹھواں باب

دو تین روز کے بعد اسلم لاہور پہنچ گیا۔ شیخ انتظار حسین اور بیگم زینت کو اس نے تمام واقعات بڑے ادب و احترام کے ساتھ سنا دیئے۔ اسلم کی ناکامی کی خبر سن کر ان کے دل ناامید ہوگئے اور کچھ عرصے کے لیے انہوں نے چپ سادھ لی۔ البتہ ایک دو مرتبہ شیخ انتظار حسین نے اسلم سے اس جانکاہ حادثے کے متعلق شدید رنج و غم کا اظہار کیا۔ ایک روز اسلم جب دفتر سے گھر پہنچا تو اسے یہ معلوم ہوا کہ شیخ انتظار حسین اور بیگم زینت کسی عزیز کے گھر گئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اسلم موقع کو غنیمت جانتے ہوئے زرینہ کو بالائی منزل پر ملنے کے لیے آیا۔ اس وقت زرینہ اپنے کمرے میں کپڑے پریس کر رہی تھی اسلم نے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے کہا

"سنائیے آج کل کیا ہو رہا ہے؟"

یہ سنتے ہی پہلے تو وہ مسکرا دی اور اس کے بعد اس نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

ہونا کیا ہے۔ بات آئی .... گئی .... اور ختم ہو گئی۔"

"مگر یہ بات ختم ہونے والی نہیں تھی۔" اسلم نے اسے یونہی چھیڑتے ہوئے کہا

"مگر معلوم تو یہی ہوتا ہے کہ آپ نے واقعاتی طور پر اسے ختم ہی کر دیا ہے۔"

"یہ بھی تو حضور کی ہی ذرہ نوازی ہے۔"

"مگر آپ کا حسنِ تدبیر بھی تو کسی سے کم نہیں۔"

"جہاں آپ کی دعاؤں کا دخل ہو وہاں ہم اور ہمارے حسنِ تدبیر کا کیا ذکر"

جب زرینہ سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو اس نے سر کھجلتے ہوئے کہا،

"آپ کن الجھنوں میں پھنس گئے ہیں۔"

"یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے" اسلم نے رومال سے اپنے جوتے صاف کرتے ہوئے کہا زرینہ برابر کپڑے پریس کرتی رہی، اسلم چند ساعت خاموش رہ کر کسی ضروری کام کے یاد آ جانے کی وجہ سے تیز تیز قدم اٹھائے کمرے سے باہر نکلا زرینہ نے اسے یوں غیر معمول باہر جاتے دیکھ کر زور سے کہا۔

"اجی میں نے کہا ذرا سنئے تو!"

اسلم نے واپس آتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا

"مجھے ذرا جلدی ہے بتلائیے تو!"

"..... جلدی ہے تو پھر ج...... ل...... د...... ی" زرینہ نے

بات کاٹتے ہوئے کہا

"کیا مطلب میں کچھ سمجھا نہیں"

"آخر سمجھنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟"

"آخر تمہارا مقصد کیا ہے؟"

"اجی چھوڑیئے ان باتوں کو آپ کہاں جا پہنچے۔ میں نے دراصل آپ کو اس لیے یاد کیا ہے کہ آپ نے کراچی میں کیا کیا اور کیا نہ کیا" زرینہ نے استری جھاڑتے ہوئے کہا۔ اسلم اس کے قریب کرسی پہ بیٹھتے ہوئے بولا

ع "نہ سنو میری داستاں نہ سنو"

زرینہ نے استری کو ایک طرف رکھتے ہوئے جواب دیا

ع "کچھ تو کہیئے کہ لوگ کہتے ہیں ؛ آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا"

"اچھا تو پھر سنیئے! کراچی گئے۔ سب سے ملے مگر نہ مل سکے تو اپنے بزرگوں سے کبھی زمانے میں یہ سنا تھا کہ "جوئندہ یابندہ" مگر معلوم ہوا کہ اس مقولے کا اطلاق یا تو کسی اور دنیا میں ہوتا ہے یا پھر کسی چیز کو پا لینے کے بعد اسے بولتے ہیں۔ بہت ڈھونڈا...... بہت ڈھونڈا..... مگر بے سود۔ آخر دلبا ختہ ہو کر واپس آنے کی جو ٹھانی تو اچانک اپنے گوداموں کے محافظ سے ملاقات ہو گئی۔ اس کو دیکھتے ہی میرے دل میں مسرت و شادمانی کا لاوا پھوٹ پڑا۔ میرا خیال تھا کہ یہ بھی انہیں کے ساتھ یہاں آیا ہے۔ میں بہت خوش ہوا جوں

ہی میں نے اسے یہ کہا کہ مجھے بڑے سیٹھ صاحب کے پاس لے چلو تو اس نے وہ سب کچھ بتا دیا جو اسے شاید نہیں بتانا چاہیئے تھا۔"

یہ کہتے ہوئے اسلم کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گیئں اس نے رومال سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے پھر سے کہنا شروع کیا۔

"اس حادثے کا علم تو مجھے اس وقت سے ہی تھا جب پاکستان نیا نیا بنا اور میں نے انہیں ڈھونڈنے کے لیے آخری کوشش بھی صرف کر دی۔ جب ناکامی میری کوششوں کو ہر میدان اور ہر منزل میں شکست دینے میں کامیاب ہو گئی تو مجھے یہ یقین کر لینا پڑا کہ وہ اپنی زندگی کا ہر سفر ختم کر کے اپنی آخری منزل کو پہنچ گئے ہیں۔ اس وقت کبھی میری آنکھیں ان آنسوؤں سے تر بتر نہیں ہوئی تھیں۔ اس وقت بھی میں جانتا تھا کہ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں مگر میرا مجبور دل صبر و قناعت میں اپنی مثال آپ بنا رہا۔ خدا جانے ہمارے ملازم کی زبان میں کیا تاثیر تھی۔ اب جب بھی اس کے یہ الفاظ میرے کانوں میں گونجتے ہیں کہ اب وہ تمہیں کبھی نہیں مل سکیں گے تو صبر ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔"

زرینہ سفید جمپر کی سلوٹیں درست کرتے ہوئے بولی

"اچھا چھوڑیئے ان باتوں کو ابّا جان نے آپ سے کیا کہا تھا۔"

"ابا جان کیا کہہ سکتے ہیں جب تک آپ کی والدہ صاحبہ کے حضور سے کوئی منظوری نہ ہو" اسلم نے انگڑائی لیکر کھڑے ہوتے ہوئے کہا

تاہم وہ ہمارے ہم خیال تو ہیں ۔"

" حالات کے ساتھ ساتھ خیالات کا بدل جانا کوئی بڑی بات نہیں "

" ان کے خیالات کے بدل جانے سے کیا بنتا ہے جب میاں بیوی راضی تو

کیا کرے گا قاضی!"

" قاضی نے کیا کرنا ہے نکاح الٹ پڑھا دیگا ۔"

" اچھا تو پھر سیدھا ہم خود پڑھ لیں گے اگر خدا نے چاہا تو!"

اتنے میں پیچھے سے زرینہ کے والدین کے آنے کی آہٹ ہوئی اور ان کے

خیالات کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

نواں باب

اسی رات شیخ انتظار حسین اور بیگم زینت باہم صلاح و مشورے سے زرینہ کی شادی کو آخری شکل دینے کے لیے بیٹھے۔ شیخ انتظار حسین اس فیصلہ پر تل چکے تھے کہ زرینہ کی جب بھی شادی ہو گی تو اسلم ہی سے ہو گی۔ مگر بیگم زینت بضد تھی۔ کہ اگر زرینہ کی شادی اسلم سے ہی کرنی ہے تو پھر میں اسے تمام عمر کنواری رہنے پر مجبور کروں گی۔

"پھر تم یہ شادی کر چکی۔ اور ہم کرا چکے۔ رہنے دو کنواری اسے۔"

"کیوں رہنے دوں کنواری، دنیا ہمیں کیا کہے گی۔"

"وہ صرف یہی کہے گی۔ کہ بیگم زینت کو کوئی داماد پسند نہیں آتا۔"

"مجھے پسند نہیں آتا۔ یا آپ کو۔"

" مجھے جو پسند آنا تھا۔ وہ آچکا۔ سن لیا تم نے ؟"

" میں نہیں جانتی کہ اسلم میں وہ کونسی خوبیاں ہیں جن کے سامنے دنیا کے باقی لڑکے ہیچ ہیں ؟"

" اسلم میں کوئی ایسی عادت نہیں جسے ہم عیب کا نام دے سکیں ۔ اس پہ طرہ یہ کہ اس نے زرینہ کو سکھوں کے چنگل سے چھڑانے کے لیے جو ہماری خدمت کی ہے۔ ایسی سعادت کسی اور نوجوان کو نصیب ہی نہیں ہو سکتی ۔"

" اسلم کی ہر شرافت کو میں اچھی طرح سے جانتی ہوں ۔ مجھے وہ وقت یاد ہے جب اس نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر زرینہ کو سکھوں سے بچایا تھا۔ مگر اس کے والدین اور دیگر رشتے دار ہمیں نہ مل سکے۔ جس سے مجبور ہو کر ہم نے خاندان کی روایات کو بحال رکھتے ہوئے زرینہ کا ہاتھ اسلم کے ہاتھ میں نہیں پکڑا سکتے ۔"

" اگر اس کے والدین ہی اسے مل جاتے۔ تو وہ کبھی آپ کی زرینہ کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوتا اس کا قصور صرف یہی ہے کہ اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ۔"

" دراصل شادی کرنے میں تو مجھے کوئی عذر نہیں مگر میں اپنے سماج سے ڈرتی ہوں ۔ جو اس شادی کے بعد صرف ایک ہی پھونک میں مدہوش کر دیگا۔ یہ سماج والے ہم پہ ہزاروں کی تعداد میں آوازے کسیں گے اور ہم کسی کی آواز

کا جواب نہ دے سکیں گے اس وقت ہم کسی کو اپنا چہرہ نہ دکھا سکیں گے۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ تمہارا سماج کیا کہتا ہے۔"

سماج یہ پکار پکار کر کہتا ہے کہ ہمیشہ خاندانی روایات کو برقرار رکھو۔ شادی کے وقت ہمیں یہ بتانا پڑیگا کہ زرینہ کے سسرال کون اور کیسے ہیں۔ کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا اصل و نسب کیا ہے اگر اس وقت یہ پتہ چل گیا کہ اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ تو اس وقت ہم پر یہ آوازے کسے جائیں گے کہ داماد کی خدمات کے صلے میں ان لوگوں نے زرینہ کو نذرانے کے طور پر پیش کیا ہے اس وقت ہمارا سماج یہ کہے گا کہ اسلم کی کمائی پر اپنی زندگی بسر کرنے کے لیے زرینہ کو اپنی خواہشات کی خاطر بیچ دیا گیا۔ اس وقت ہمارا ہر بیان سماج کے قہقہوں کے ہاتھوں قتل ہو جائے گا۔"

"ہم ان کے رہنے کے لیے علیحدہ انتظام کر دیں گے۔"

"علیحدہ انتظام کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ جبکہ ہمارے خاندان میں ہر ایک اسلم کو اچھی طرح سے جانتا ہے۔"

"اب میں کیا کر سکتا ہوں۔ کیونکہ میں نے اسلم کو بتا دیا تھا کہ میں تمہیں اپنا داماد بنانے والا ہوں۔"

"وہ آپ اس سے اپنی مجبوری کا اظہار کریں وہ ایک شریف اور سمجھدار لڑکا ہے۔ وہ فوراً ہمارا ہم خیال بن جائے گا۔"

"مگر اس سلسلے میں ہمیں زرینہ سے مشورہ کرنا چاہئے۔"

"زرینہ سے میں اس وقت تک نہیں پوچھ سکتی جب تک اس کے لیے کوئی رشتہ نہ ڈھونڈ لوں۔"

"لیکن کچھ نہ کچھ تو ضرور پوچھ لینا چاہیئے۔ کیونکہ وہ اسلم کے معاملات میں بہت دلچسپی لیا کرتی ہے۔"

"آپ اگر مجھے مجبور کرتے ہیں تو میں ابھی اس سے پوچھ کر آتی ہوں۔"

بیگم زینت زرینہ سے پوچھنے کے لیے بالائی منزل پر گئیں۔ تمام کمرے ایک ایک کر کے دیکھ ڈالے۔ مگر زرینہ نہ مل سکی۔ بیگم زینت کے دل کی دھڑکن بڑھتی گئی۔ آخر وہ دبے پاؤں نیچے اسلم کے کمرے میں گئیں۔ زرینہ اس وقت اسلم کے کمرے میں صفائی کر رہی تھی۔

یہ کیا کر رہی ہو۔" بیگم زینت نے دروازے میں کھڑے ہو کر پوچھا۔

زرینہ بولی

"صفائی کر رہی ہوں امی جان"

"اچھا یہ بتاؤ۔ اسلم کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے"۔

"میں اسلم کے علاوہ کسی اور لڑکے کی رفیقۂ حیات ہرگز ہرگز نہیں بن سکتی۔"

"بدتمیز..... بے حیا خاموش رہو۔"

پیشتر اس کے کہ زرینہ مزید کچھ کہتی بیگم زینت جا چکی تھی۔ زرینہ کے اس جواب سے اس کے والدین کے کان کھڑے ہو گئے۔ چنانچہ وہ اس نتیجے پر پہنچے۔ کہ اسلم کو کسی نہ کسی طرح دہلی روانہ کر دیں۔ بعد میں زرینہ کا کسی دوسرے سے نکاح پڑھا دیا جائے۔

دوسرے دن شیخ انتظار حسین نے اسلم کو بڑی ہمدردی کے ساتھ کہا!
"دیکھو اسلم! سنی سنائی باتوں پر کبھی یقین نہ کیا کرو۔ میرا دل اب بھی یہی کہتا ہے کہ ہو نہ ہو تمہارے والدین دہلی ہی میں مقیم ہیں۔ کیونکہ اب بھی وہاں پر مسلمانوں کی بڑی تعداد ہے"۔

"........ مگر میں نے تو وہاں پر کئی خطوط بھیجے تھے جن کا کوئی جواب موصول نہ ہو سکا۔" اسلم نے بات کاٹتے ہوئے جواب دیا ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اور جگہ مقیم ہوں۔ ان کو تمہارا خط نہ مل سکا ہو اور ان کا جواب نہ آ سکا۔ بیٹا اسلم! تم جلدی پاسپورٹ بنوا کر دہلی جاؤ تاکہ اس کے بعد نہ کوئی وہم رہے اور نہ کوئی گمان اور ہم تمہاری شادی کر کے زرینہ کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں"۔

اسلم، شیخ انتظار حسین کی چکنی چپڑی باتوں میں آ گیا۔ پاسپورٹ بنوا کر سامان سفر باندھنا شروع کر دیا۔ شیخ انتظار حسین نے جاتی دفعہ بار بار یاد کرا دیا کہ آنے سے پہلے اپنی کامیابی یا ناکامی کا خط

ضرور لکھنا تاکہ میں یہ معلوم کر سکوں۔ کہ تم کب آرہے ہو۔

دسواں باب

اسلم بعد از دوپہر دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر اترا سب سے
پہلے وہ اسی جگہ پہنچا جہاں ان کی لاکھوں روپے کی بلڈنگیں کھڑی
تھیں۔ اس کی آنکھیں یہ دیکھ کر دنگ رہ گییں کہ جہاں ان کے گودام
تھے۔ اب وہاں ایک عالیشان ہوٹل ہے جہاں ان کی حویلی تھی اب وہاں
سیٹھ پرماس لال کا سیل ڈپو ہے اور جہاں ان کی دیگر عمارات تھیں
اب وہاں تجارت ہائے رنگا رنگ ہو رہی تھی اس کی آنکھوں کے
سامنے حمید کی ملاقات کا وہ منظر گھوم گیا اس کے کانوں میں حمید کی کپکپاتی
ہوئی آواز کے وہ الفاظ ایک بار پھر گونج گئے وہ سمجھ گیا کہ حمید نے
جو کچھ بھی کہا تھا وہ حرف بہ حرف ٹھیک تھا وہ اسی طرح گھومتا گھماتا

چاندنی چوک میں آنکلا۔ جہاں اس نے آزاد مسلم ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ میں ایک کمرہ کرائے پر لیا۔ اگرچہ اس کا سفر کی تھکان سے برا حال تھا۔ مگر پھر بھی اس نے آرام کی بجائے گھومنے پھرنے کا ارادہ کیا۔

"اب شام عنقریب ہونے کو ہے آسمان پر سورج کی الوداعی روشن کرنیں سرخی مائل ہوتی جا رہی ہیں پرندے بھی اپنے اپنے آشیانوں کی طرف آرہے ہیں مگر میرا آشیانہ خدا معلوم ؟ بھوک سخت لگ رہی ہے مگر پھر بھی مجھے شام کا کھانا کھانے سے پہلے غسل ضرور کر لینا چاہیئے"

اسلم نے کھڑکی کھولتے ہوئے کہا۔

اتنے میں بیرہ چائے لیکر کمرے میں نمودار ہوا ——————

"بابو صاحب ! چائے لے آیا ہوں" بیرے نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا ۔

"بہت اچھا ۔ ۔ ۔ مگر کیا مجھے چائے سے پہلے تھوڑا سا پانی ملے گا

اسلم نے کپڑے تبدیل کرنے کی نیت سے کوٹ کے بٹن کھولتے ہوئے کہا !

"جرور صاب ۔ ۔ ۔ ۔ جرور ۔ ۔ ۔ ۔ کیوں نہیں ملے گا ۔ ۔ ۔ جرور ملے گا"

یہ کہتے ہوئے بیرہ پانی لینے کے لیے دوڑا ۔

جب وہ پانی لے کر کمرے میں داخل ہوا ۔ اس وقت اسلم اپنے

تھا۔ کپڑے تبدیل کر کے کرسی پہ بیٹھنے ہی والا تھا۔ اسلم نے پانی کا گلاس اس کے ہاتھوں سے پکڑتے ہوئے کہا۔

"کیا یہاں نہانے کا انتظام ہے۔ ۔ ۔ ۔"

"جرور ہو گا جی۔ جرور ہو گا۔ یہ کہتے ہوئے بہرہ پھر کمرے سے باہر چلا گیا۔

جب اسلم چائے پی چکا۔ تو بہرہ دوبارہ کمرہ میں داخل ہوا۔

"نہانے کا تو انتظام ہو گیا ہے مگر پانی ذرا ٹھنڈا ہے"

"کوئی بات نہیں میں ہمیشہ ٹھنڈے پانی سے ہی نہاتا ہوں۔ مگر میرے نہا کر واپس آنے تک تم میرا کھانا لا کر رکھ دینا"۔ اسلم نے تولیہ اور صابن لیتے ہوئے جواب دیا۔

اسلم نے کھانا کھانے کے بعد لباس تبدیل کیا۔ بہرے سے کھانے اور چائے وغیرہ کا بل لیتے ہوئے اسے دس روپے کا نوٹ دے کر جلدی سے دروازہ بند کر کے باہر گھومنے کے لیے نکلا۔ وہ متعدد بار ایک ہی بازار سے گزرتا رہا اور آخر میں اس عمارت کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ جہاں ان کا گھر تھا۔ وہ کافی دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ اگر وہاں کوئی ہوتا تو اس کو پہنچانتا۔ وہاں کی تو دنیا ہی بدل چکی تھی

اسلم آرام کرنے کی غرض سے اپنی قیام گاہ کی طرف آ رہا تھا کہ ریسٹورنیٹ

کے اندر اس بھرے نے روک لیا۔ کہاں چلے گئے تھے میں آپ کو ڈھونڈ رہا تھا۔ یہ لیجئے باقی پیسے" "کوئی بات نہیں۔ انہیں اپنے پاس رہنے دو۔ ابھی تم سے میں نے کافی کام لینے ہیں"

"او بابو صاب! خدا آپ کو خوش رکھے روزانہ آپ کی کامیابی اور صحت کی دعائیں مانگا کروں گا۔ جب بھی آپ چاہیں یہ خادم ہر وقت خدمت کے لیے حاضر رہے گا۔

اسلم کپڑے تبدیل کر کے بستر پر دراز ہوتے ہی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ صبح آٹھ بجے اسلم کی آنکھ کھلی سورج کی شعاعیں کھڑکی سے اس کے چہرہ اور بستر پر پڑ رہی تھیں۔ اسلم نے شرٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے کہا۔

" اوہو . . . . . بڑی دیر ہو گئی۔ آف توبہ! آٹھ بج گئے آدھا رے باپ رے باپ آج نصف دن . . . . تو یونہی گذر گیا"

صبح نو بجے کے قریب جب اسلم ناشتے سے فارغ ہو کر بازار نکلا جونہی وہ اجمیری دروازے میں داخل ہونے لگا اس کی ملاقات مسٹر نسیم الدین نسیم سے ہوئی۔ جو ان کے عزیز ترین دوست ہونے کے علاوہ ان کے پرانے کرایہ دار تھے۔

" ہیلو مسٹر اسلم !! اتنے دنوں کے بعد تم یہاں کیسے آئے"

نسیم نے اسلم کو دیکھتے ہی کہا۔

" بس آپ لوگوں کی محبت مجھے یہاں کھینچ لائی"

" ہماری محبت! بہت خوب . . . . بہت خوب . . . مگر یار تم تو بہت

بدل گئے خیر تو ہے"۔

"کیا بتاؤں . . . . ۔"

؎ رہ گئے کہنے کو کچھ کچھ ہیں فسانے باقی
اب نہ دہلی ہی رہی اور نہ زبان دہلی
ہیں نئے رنگ نئے ڈھنگ نئی گفت و شنید
ایک عالم سے نرالا ہے جہانِ دہلی . ."

"ہو . . . . . ویری گڈ . . . . . ویری گڈ . . . . بھئی اب تو تم شاعر بنتے جا رہے ہو"۔

"مگر یہ شعر تو چوری کے ہیں"

"چوری کے ہیں۔ اوہ . . . . . ونڈر فل . . . . ونڈرفل آج کل چوری کی عادت ہر ایک کو ہو گئی ہے ہندوستان کے ایک دم بھارت بننے سے جہاں زر و مال کی چوری چکاریوں میں ہوش ربا اضافہ ہو رہا ہے۔ وہاں علم و ادب کی چوریوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے ابھی کل کی ہی بات ہے۔ کہ ہندوستان کے ایک مشہور فلمساز کو ایک کہانی چوری کرنے کے الزام میں بمبئی ہائی کورٹ نے گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے ہیں چلو آؤ گھر چلیں۔ اماں جان تمہیں بہت یاد کرتی ہیں جب بھی کبھی تمہارا یا تمہارے والدین کا ذکر ہوتا ہے۔ تو وہ یہی کہتی ہیں کہ

اسلم لاہور میں ہو گا کبھی نہ کبھی وہ ضرور ہمیں ملنے آ جائے گا۔"

"گھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا تمہارے گھر کو آگ نہیں لگی تھی۔"

"مجھے یہ بتانا یاد ہی نہ رہا کہ جب یہاں قتل و غارت کا بازار گرم ہوا اور کرفیو کے نفاذ کا اعلان ہوا۔ تو ہم صدر بازار سے حوض قاضی حویلی رضیہ بیگم میں آ کر مقیم ہو گئے۔ ہمارے خاندان کے دیگر پچاس گھرانے بھی وہیں مقیم تھے۔ ہم نے آنے سے پہلے آپ کے والدین کو بھی مشورہ دیا۔ کہ وہ ہمارے ہاں حوض قاضی چلیں۔ مگر وہ بضد تھے۔ کہ "جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔" اس واقعہ سے تین چار روز بعد صدر بازار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں آگ لگ گئی۔ جس کی لپیٹ میں آپ کے تمام مکانات کے علاوہ آپ کا گھرانہ بھی آ گیا اس واقعہ سے ٹھیک سات روز بعد ہندوؤں کو ہمارا بھی علم ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے بدمعاشوں کے گروہ کے ہمراہ ہمیں بھی زک پہنچانے کی کوشش کی انہوں نے شرارتیں بپا رکھی تھیں۔ ہم نے رو رو کر خدا کے حضور سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔ ہمارے ایک ماموں صاحب جنہیں ہم بھکڑ کہا کرتے تھے پچھلے سال ان کا ہیضے کی وجہ سے انتقال ہو گیا خدا انہیں جنت نصیب کرے انہوں نے ایک ترکیب سوچی اوپر کی برساتی کا پرنالہ اتار کر کھڑکی میں رکھ دیا۔ اور کاغذ جلا جلا کر اس میں دھواں چھوڑنا شروع کر دیا۔ وہ بدمعاش یہ سمجھے کہ شاید ہم توپ کا گولہ چھوڑنے والے ہیں چنانچہ وہ آئیں واعدیں کمانوں

میں انگلیاں ٹھونس کر دھوتیوں کو ٹخنوں سے اوپر اٹھا کر جوتیاں ہاتھ میں پکڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے ....

"آؤ ہم اس طرح ایک بار پھر اس دنیا میں رہنے کے قابل ہو سکے"

اسلم نے دوپہر کا کھانا نسیم کے ہاں کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد اسلم اور نسیم پھرتے گھومتے چاندنی چوک میں داخل ہوئے۔ سب سے پہلی آواز جوان کے کان میں پڑی وہ یہ تھی! ۔

"نہ پتہ چلتا ہے۔ کہ مسلمان کا بچہ کون ہے اور نہ پتہ چلتا ہے ہندو کا بچہ کون ہے۔ نہ کسی کی داڑھی ہے۔ نہ کسی کی مونچھ۔ سب انگریزوں کی تعلیم کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ تم داڑھیاں رکھ کر میرے پاس آؤ۔ پھر میں بہت خوش ہوں گا۔"

یہ آواز ایک مولوی صاحب کی تھی جو والہانہ طور پر ہندو، سکھ اور مسلمانوں کو اپنا خطبہ سنا رہے تھے۔ عورتیں انہیں دیکھنے کے لیے بڑے شوق سے آگے بڑھتیں اور بچے انہیں اسی طرح اپنے گھیرے میں لیکر اپنا دل خوش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ گویا وہ کہہ رہا ہو ۔

"ڈگڈگی بجا کے ذرا میلا لگا کے بندر کو ناچ نچاؤں گا
تمہیں بھالو کے کرتب دکھاؤں گا"

اب ملاحظہ فرمائیے ایک مختصر آتشیں بیان کو جو ایک پنساری کے

تھڑے پر چڑھ کر ماسٹر تارا سنگھ کا ریکارڈ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے!
" یہ ہے جوہر جوانی جس کی صرف ایک خوراک سے آپ کی زندگی میں بہار آ جائے گی میرے ان بچوں کو دو جو بچپن ہی میں اپنی زندگی اپنے ہی ہاتھوں سے تباہ کر بیٹھے ہیں۔ اس ماں کو دو جس کی کمر دوہری ہو جانے کی وجہ سے زمین پر لاٹھی ٹیک کر زندگی کا آخری وقت گزار رہی ہو۔ میری ان بچیوں کو دو جن کو ہر ماہ پانچ دن ماہواری کی سخت تکلیف رہتی ہو۔ اس باپ کو دو جو نماز پڑھنے کے لیے جاتا مگر ہر وقت کپڑا ناپاک رہتا۔ اس "جوہر جوانی" کی صرف ایک خوراک کے استعمال سے آپ کا چہرہ سیب کی مانند سرخ ہو جائے گا۔ کمر میں لوہے کا پٹی لگ جائے گا۔ اگر اس بوتل پر لکھے ہوئے پتے سے منگواؤ گے تو اس کی قیمت ہو گی دس روپے مگر اس وقت یہاں پر محض اپنی دوا کی مشہوری کے لیے اس کی قیمت صرف ایک روپیہ۔
ایک روپیہ۔ ہے کوئی نوجوان جو لینا چاہتا ہو۔ یہ موقع بار بار ہاتھ نہیں آئے گا۔ ہم آج یہاں ہیں کل سینکڑوں میل دور ہوں گے۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی ہے کوئی صرف ایک روپیہ . . . ! . . . . . ایک روپیہ"؟

آسلمی ان کے ہاں قریباً پندرہ یوم مقیم رہا وہ نسیم کے ہمراہ ہر روز "جامع مسجد" جاتا۔ جہاں راستے میں بڑی چہل قدمی ہوتی تھی۔ ہر روز نئے دوکاندار اور نئے خریدار اور اس پر ستم یہ کہ بغیر کوئی انکم ٹیکس ادا کئے

لوگ ہزاروں کا بزنس کرتے تھے ایک پیسے کی تین بیڑیوں والا پیکٹ لیے اور کرائے کے کپڑے پہن کر ہر روز لوگ اسی طرح دھوم دھام سے نکلتے گویا وہ بھی اپنے زمانے کے نواب واجد علی شاہ ہیں۔

"یہ ہے وہ سلاجیت میرے بھائی جو کشمیر کی پہاڑیوں میں ہوتا۔ ہم ادھر بندوق لیکر جاتا۔ مقابلہ کرتا۔ خون خرابہ ہوجاتا تب یہ سلاجیت لیکر ہم تمہارے پاس ہندوستان آتا۔ ہر روز کے احتلام سے تمہارے اندر کمزوری بڑھ جاتا۔ عورت کے قابل نہ رہتا، عورت بولتا زمین پھٹ جائے ہم اس میں جاتا۔ دیوار پھٹ جائے ہم اس میں گھس جاتا مگر اس مرد کے پاس نہ جاتا سلاجیت سے تم میں ایک دم طاقت پیدا ہوتا۔ سلاجیت کے ایک ہی مرتبہ استعمال کرنے سے تم میں "وہ قوت مردی" پیدا ہوتا کہ خدا کی پناہ . . . .

ہم کشمیر سے تمہاری خدمت کے لیے یہاں آیا۔ اسلام بولتا خدمتِ خلق سب سے بڑا نیکی ہے"

"دانت اچھے تو صحت اچھی۔ اگر آپ کے دانتوں میں خون آتا ہو۔ پیپ آتی ہو. . . . . بد بو آتی ہو. . . . مسوڑے پھولتے ہوں. . . . ایسے قسم کی ہزاروں بیماریوں کے لیے تو حسین منجن کا استعمال کیجیے گا صاحب"

"نزلہ، زکام، بخار، سر درد، ناک درد، کان درد، آنکھ درد، کے لیے ہاتھی مارکہ مرہم استعمال کیجئے جس سے لاکھوں کی تعداد میں لوگ صحت یاب ہو گئے ہیں"۔

"آپکی آنکھ میں دھند، جالا، غبار، خارش، پانی گرنا سرخی اور ضعفِ بصیر کے لیے "چراغ روشن" سرمہ مفید ہے۔ دو سلائیاں رَاہِ مولا اپنی آنکھوں میں ڈلوا لو۔ یہ وہ سرمہ ہے جس کی ایک ہی سلائی سے تمہاری آنکھوں میں بھئی! پھر وہی روشنی آجائے گی۔ جو ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے وقت تھی۔ دیکھو بھئی! ہم بوڑھے ہو گئے ہیں مگر ہماری نظر بالکل ٹھیک ہے یہ وہ سرمہ ہے جس کی ایک سلائی بلقیس شہزادی نے ڈالی تھی۔ تو وہ مصر کی ملکہ بن گئی تھی اور دوسری سلائی سکندرِ اعظم نے ڈالی تھی۔ تو وہ ساری دنیا کو فتح کرنے کے لیے نکل پڑا تھا۔ یوں تو اس کی کم سے کم قیمت پانچ روپے فی تولہ ہے مگر اس وقت پانچ آنے۔۔۔ پانچ آنے۔۔۔ پانچ آنے۔۔۔۔۔

"جریان۔۔۔۔ احتلام۔۔۔۔ انزال۔۔۔۔

یہ ایسی بیماریاں ہیں جن سے نوجوان موت سے پہلے مر جاتے ہیں۔ یہ ایسی بیماریاں ہیں جن کا علاج کسی بھی انگریزی ڈاکٹر کے پاس نہیں۔ آپ اس نوجوان کی طرف ذرا نگاہ ڈال کر دیکھیں۔ جس کا چہرہ کمزوری سے

پھیلا پڑ چکا ہے۔ برخوردار ذرا نبض تو دکھاؤ (برخوردار کو مجمع سے اپنی طرف کھینچتے ہوئے) اوہو۔۔۔ ہو۔۔۔ اوہو۔۔۔ ہو تمہاری نبض بہت تیز چل رہی ہے۔ اچھا کان ہلاؤ۔۔۔ نہیں ہلتا۔۔۔ اوہو۔۔۔ ہو کمزوری بہت ہے۔۔۔ اچھا اب ناک ہلاؤ۔ ناک بھی نہیں ہلتا۔ کمزوری بہت ہے یہ تو تمہاری خوش قسمتی ہے جو ہماری ڈسپنسری میں چلا آیا ورنہ تم منگل، بدھ، جمعرات، جمعہ، ہفتہ، اتوار، پیر اور منگل کے اندر اندر مر جاتا ویسے کوئی فکر کی بات نہیں۔ کیونکہ مایوسی گناہ ہوتی ہے۔ دنیا میں کوئی مرض نہیں جو لاعلاج ہو۔ میرے ایک ہی ہفتے کے علاج سے تم پہلوان سے زیادہ تگڑے ہو جاؤ گے"۔

اسلم ان نئے دوکانداروں کی دوکانداری دیکھ کر اکتا گیا۔ اس لیے اس نے واپس لاہور آنے کے لیے سامان کو درست کیا۔

"اب مجھے جانے کی اجازت دیجئے۔ تاکہ میں جلد از جلد لاہور پہنچ سکوں۔" اسلم نے اپنا سامان درست کر کے کپڑے بدلتے ہوئے کہا۔

"کیوں! آخر اتنی جلدی بھی کیا ہے"! نسیم نے استفسار کرتے ہوئے کہا۔

"دراصل دفتر سے چھٹیاں ختم ہو گئیں ہیں جس کی وجہ سے مجھے دفتر پر پہنچنا چاہیئے"۔

"اچھا اب کب آؤ گے"

"جب خدا لائے۔"

"لاہور جا کر گاہے بگاہے خط ضرور لکھا کرنا۔"

"بہت اچھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خدا حافظ"

"خدا حافظ"

گیارہواں باب

اسلم کو دہلی بھیجنے کی اسکیم شیخ انتظار حسین نے خود بنائی تھی۔ جب تک اسلم کا پاسپورٹ نہیں بنا تھا اس وقت تک کسی کو بھی اس راز کا علم نہیں تھا کہ آخر اسلم کو کس مقصد کے لیے دہلی بھیجا جا رہا ہے جس دن اسلم کا پاسپورٹ بنا اس کے دوسرے دن علی الصبح اسے دہلی روانہ ہونا تھا۔ رات کو جب شیخ انتظار حسین سونے لگے تو انہوں نے بیگم زینت کو بتایا کہ لو بیگم ہمارا نصف کام تو ختم ہو گیا ہے

بیگم زینت نے بغیر کسی سوچ وبچار کے پوچھا۔ وہ کیسے!

جواب ملا :۔

"وہ ہے نا اسلم ...... اپنا اسلم ...... اسے میں نے بڑی سنجیدہ صورتنا

بنا کر فصاحت و بلاغت سے کام لیتے ہوئے یہ سکھایا پڑھایا کہ تمہارے لیے دہلی جانا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ کھانا پینا۔ میری باتوں سے اسے پختہ یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو اس کے والدین ضرور زندہ ہیں الغرض وہ میری باتوں میں آگیا۔ جب سے میں نے اسے الو بنا لیا اس کا پاسپورٹ بن چکا ہے اور وہ صبح سویرے دہلی جانے والا ہے اس کے دہلی جانے کے بعد ہم جلد ہی زرینہ کے لیے کوئی رشتہ ڈھونڈ لیں گے اور رشتہ ملتے ہی ہم زرینہ کا نکاح فوراً پڑھا دیں گے۔ کیونکہ اس طرح ایک طرف زرینہ مطمئن ہو جائے گی۔ اسے یہ بتا دیا جائے گا کہ اس کے والدین ابھی تک زندہ ہیں اور انہوں نے دہلی واپس بلا لیا ہے۔ اس لئے اب اسلم کبھی واپس نہیں آئے گا اور جب واپس آئے گا۔ تو اس کو یہ بتا دیں گے کہ تم نے آنے میں دیر کر دی۔ جب سے ہم نے مجبور ہو کر زرینہ کی رسم نکاح ادا کر دی۔ وہ ظاہری طور پر سب کچھ سمجھ جائے گا۔ اور اپنی راہ و رسم سے خود بخود واقف ہو جائے گا۔"

بیگم زینت اس اسکیم سے مطمئن ہی نہ ہوئی بلکہ بہت خوش بھی ہوئی جس دن زرینہ نے بیگم زینت کو یہ بتایا تھا کہ وہ اسلم کے بغیر کسی بھی دوسرے نوجوان کو اپنا شوہر قبول کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ ہو گی اس دن سے زرینہ اپنے ماں باپ کے ساتھ ایک ہی کمرے میں سوتی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ زرینہ سوئی ہوئی ہے۔ مگر زرینہ یہ سب کچھ جو ہوا تھا۔ حرف بحرف سن رہی تھی۔

آمنہ بڑی بے تابی کے ساتھ صبح کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے حتی الامکان کوشش کی۔ کہ رات کو وہ سو نہ سکے تاکہ علی الصبح اسلم کے جانے سے پہلے اس کے پاس جا کر رات کی تمام کارروائی اس کو سنا دے اور اسے دہلی جانے سے روک لے۔ مگر جب زرینہ صبح کو اسلم کے کمرے میں پہنچی۔ اسلم جا چکا تھا۔ وہ ایک سرد آہ نکال کر اپنے کمرہ میں واپس آ کر اپنے خیالات پریشاں میں کھو گئی۔

اسلم کے دہلی روانہ ہو جانے کے بعد شیخ انتظار حسین ذرا اداس اداس سے نظر آنے لگے۔ جس کی وجہ انہوں نے ایک دن بیگم زینت کو یہ بتائی۔ کہ انہوں نے بہت سخت غلطی کی جو اسلم کو دہلی بھیج دیا۔ اب اگر خدانخواستہ اس کے والدین اسے وہاں مل گئے تو وہ کبھی واپس نہیں آئے گا اب تو خدا سے ہر دم یہی دعا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اسلم لاہور آ جائے تاکہ ہم اس کے ساتھ زرینہ کے دو بول پڑھا دیں۔"

"اچھی کیوں ..... وہ کیوں؟" بیگم زینت نے بوکھلا کر پوچھا۔

"بیگم میں نے بہت کوشش کی کہ کہیں سے کوئی رشتہ مل جائے مگر ناکامی کے سوا کچھ نہ ملا۔ جیسا کہ تم جانتی ہو۔ ہمارے خاندان میں کوئی ایسا نہیں جس کے ساتھ زرینہ کا بیاہ رچایا جا سکے دوسرے خاندان میں بھی لڑکا ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر کیا بتاؤں جتنے بھی لڑکے مجھے پسند آئے ان سب کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ اس لیے میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ زرینہ کی شادی اسلم سے ہی

۹

کر دی جائے ۔ تو بہتر ہے"

" مگر کیا آپ بھول چکے ہیں۔ سماج کے وہ الفاظ . . . . . "

" سماج جو کچھ کہتا ہے۔ کہہ لینے دو اس کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں ہے"

انسان کے لیے یہ کہہ دینا آسان ہے مگر اپنے خلاف کچھ بھی سننا اسے کبھی گوارا نہیں ہوتا"

" مگر مجبوری بھی تو کسی کا نام ہے"

" کوشش کیجئے! کوشش سے ہر کام بخوبی انجام دیا جا سکتا ہے۔"

۵

بارھواں باب

شیخ انتظار حسین کے شیخ امتیاز علی کے ساتھ بڑے گہرے روابط قائم تھے کیونکہ انہوں نے ایک ہی سال بی۔ اے کا امتحان گورنمنٹ کالج سے پاس کیا تھا اور اس کے بعد لاہور سیکرٹریٹ کے ایک سیکشن میں اکٹھے ملازم ہوئے تھے۔ پانچ سال کے بعد شیخ امتیاز علی نے ملازمت سے استعفیٰ دے کر اپنا کاروبار شروع کر دیا۔

پاکستان کی آزادی کے بعد ناگزیر حالات سے فائدہ اٹھا کر شیخ امتیاز علی کے کاروبار کو خوب وسعت ملی جس سے وہ تھوڑے ہی عرصہ میں شیخ امتیاز علی سے سیٹھ امتیاز علی بن گئے۔ ان کی یادگار صرف دو بچے نفیر

اور ناہید تھے۔ سیٹھ امتیاز علی بوڑھے ہو چکے تھے اس لیے تمام کاروبار نصیر نے سنبھال رکھا تھا۔

ایک دن شیخ انتظار حسین اور سیٹھ امتیاز علی کی ملاقات غیر متوقع انارکلی میں ہوئی۔ سیٹھ امتیاز علی نے شیخ انتظار حسین کو دور سے دیکھ کر بلند آواز میں مسکراتے ہوئے کہا!

"السلام وعلیکم.......... مزاج تو اچھے ہیں حضور کے"

"وعلیکم السلام.......... خدا کا شکر ہے اور آپ کا شکریہ" !!!

شیخ انتظار حسین نے سیٹھ امتیاز علی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا

"ہمارا شکریہ! کیا کہنے شیخ صاحب کے !!! آیئے ذرا یہاں چائے ہی نوش کریں"

شیخ امتیاز علی شیخ انتظار حسین کو ہاتھ سے پکڑ کر میجسٹک ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ پہلے کیبن میں بیٹھتے ہوئے انہوں نے چائے کا آرڈر دیا۔ سیٹھ امتیاز علی نے گرم گرم چائے کا گھونٹ اپنے بزم سے حلق میں زبردستی نگلتے ہوئے کہا۔

"سنایئے! شیخ صاحب !!! آپ کے بچوں کا کیا حال ہے"

"ہمارے بچے کونسے ہیں جن کا حال آپ کو بتائیں۔" شیخ انتظار حسین نے بڑی بے پرواہی سے جواب دیا۔

او ہو۔۔۔ ہو ہو ہو۔۔۔۔۔۔۔ میرا مطلب اس زرینہ سے تھا۔ جسے ابھی تک اگر بچہ نہیں تو بچی ہی کہا جا سکتا ہے۔" شیخ امتیاز علی نے اپنی غلطی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"او۔۔۔ زرینہ۔۔۔۔ زرینہ بس ٹھیک ٹھاک ہے۔" شیخ انتظار حسین نے قدرے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ نے ابھی تک زرینہ کی شادی نہیں کی!"

"جی! نہیں!!!"

"کیوں؟ اب تک تو اس کی شادی کر دینی چاہیئے تھی"۔

"ابھی دراصل ہمیں کوئی ایسا رشتہ نہیں ملا جسے ہم پسندیدہ نگاہوں سے دیکھیں۔ ہم کوئی ایسی غلطی نہیں کرنا چاہتے جس سے زرینہ کو یہ کہنا پڑے کہ۔

ع "دیکھ مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو"۔

نصیر کی شادی کا باعث بھی یہی وجہ ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔

دولت لاکھوں کروڑوں تک جا پہنچی ہے کاروبار وسیع سے وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ میں کاروبار کی طرف سے بے فکر ہوں۔ لیکن نصیر کی شادی کے مسئلہ نے بے چین کر رکھا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری بہو کسی آزاد خیال خاندان سے آئے۔ کیونکہ آزاد خیال لڑکیاں گھروں کو سنبھالنے

کی بجائے بگاڑنے میں زیادہ ماہر ہوتی ہیں ہمیں تو ایک ایسی لڑکی چاہیئے جو کسی قدیم مہذب خاندان سے تعلق رکھتی ہو۔ سلیقہ شعار بھی ہو۔ اور پابند صوم وصلوٰۃ بھی۔ خوبصورت بھی ہو۔ اور خوب سیرت بھی "۔

" اگر ناگوار نہ ہو تو ایک بات کہوں "۔ شیخ انتظار حسین نے چائے کا آخری گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

" ہاں ۔۔۔۔ کہو ۔۔۔ ضرور کہو ! تمہارے اور ہمارے مابین آج کل کوئی پوشیدہ راز نہیں رہا ہم ایک ہی تو ہیں "۔

" کیا زرینہ آپ کی بیٹی بن سکتی ہے ؟ " شیخ انتظار حسین نے کہا۔

" ہوں ! بات تو آپ نے معقول نہیں بلکہ بڑی درست کہی ہے۔ ہمارے تعلقات بھی برسوں سے چلے آتے ہیں نصیر اور زرینہ کی شادی کے بعد ہم آپس میں اس طرح مل جائیں گے کہ پھر دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جدا نہیں کر سکے گی "۔

" آپ فرما تو درست رہے ہیں لیکن اپنی بیگم سے بھی مشورہ کر لیں "۔

اس کی کوئی فکر نہ کریں۔ اگر میں راضی تو سمجھئے میری بیوی بھی راضی اگر ہو سکے تو آپ بھی اپنے گھر میں ضرور صلاح و مشورہ کر لیں "۔

" بس بوڑھا بوڑھی راضی تو کیا کرے گی صاحبزادی "۔ شیخ انتظار حسین نے مسکرا کر کہا دونوں میجسٹک ہوٹل کے باہر فٹ پاتھ پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ سیٹھ امتیاز علی نے اس بات کو دہرا کر کہا "ہم دونوں کا شیخ خاندان سے تعلق ہے اگر بیٹیں

تو اچھا ہی ہو گا۔"

"جی ہاں! آخر کیا بُرا ہے آپ کل نصیر کی والدہ کو بھیجیں تاکہ وہ زرینہ کو بھی دیکھ لیں۔ اور زرینہ کی اماں کے ساتھ رسمی طور پر اس رشتے کو فیصلہ کن مراحل تک پہنچا دیں" یہ کہتے ہوئے شیخ انتظار حسین کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

"وہیں نسبت روڈ پر جہاں میں ایک روز آیا تھا۔

"جی ہاں! وہیں" شیخ انتظار حسین نے سیٹھ امتیاز علی سے مصافحہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

سیٹھ امتیاز علی کے رخصت ہو جانے کے بعد شیخ انتظار حسین مسرت و شادمانی کے طبلے بجاتے رقصاں و خنداں خوش خوش گھر کو لوٹے۔ بیگم زینت اپنے برابر سلائی مشین رکھے۔ ایک جمپر سینے میں مصروف تھی۔

شیخ انتظار حسین نے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔

"لو بیگم آج تمہارا کام بن گیا۔"

بیگم زینت نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

"کیوں! کیا ہوا؟"

"بس کچھ نہ پوچھو۔"

"پھر بھی!؟" وہ بولی۔

"بس یوں سمجھ لو کہ آج زرینہ کی قسمت کو چار چاند لگ گئے"

شیخ انتظار حسین نے سنجیدہ صورت بناتے ہوئے کہا۔
"مگر کیسے؟" بیگم زینت نے خوش ہو کر پوچھا۔
"وہ ہیں نا! سیٹھ امتیاز علی جن سے میرے بچپن کے مراسم چلے آتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

"ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں! میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں" بیگم زینت نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔
"وہ آجکل کروڑ پتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ لاکھ پتی نہیں کروڑ پتی ۔ ۔ ۔ ۔ کروڑ پتی!!"
"تو پھر کیا ہو گیا۔ ان کروڑ پتیوں کو؟" بیگم زینت جھنجھلا کر بولی۔
"بس اتنی بات سے پارہ چڑھنا شروع ہو گیا"
"آخر آپ کچھ بات بھی تو بتائیں یوں خواہ مخواہ تاخیر سے کیا فائدہ"
"کاش تم نے تھوڑا سا انتظار کیا ہوتا تو سب کچھ تم کو بتا دیتا"
"انتظار کا انتظار کون کرے"
"آہاہا! کاش تم شاعرہ ہوتی تو تمہارے ہونٹوں سے ایسی طنزیہ باتیں بڑی معلوم ہوتیں"
"مگر افسوس تم شاعرہ نہ ہوئیں۔ تم ایک عورت ہو۔ صرف ایک عورت۔"
شیخ انتظار حسین نے بڑے فلسفیانہ انداز میں غور و فکر کرتے ہوئے کہا۔
"آخر آپ کیا کہنا چاہتے ہیں" بیگم زینت نے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتے

ہوئے پوچھا۔

"امرِ واقع یہ ہے کہ وہ آج مجھ سے ملے۔! بات چیت.... ہوئی جو ختم ہو گی۔ یعنی کہ زرینہ اور نصیر کی منگنی ہو گی۔

"سچ" بیگم زینت نے خوشی سے پھولتے ہوئے کہا۔

"بالکل سچ! تو اور کیا جھوٹ بولا میں نے تم سے! جہاں وہ دولت میں ہم سے کروڑوں درجے آگے ہیں اسی طرح ان کا گھرانہ بھی ہم سے زیادہ شریف ہے"۔ شیخ انتظار حسین نے بیگم زینت کے کندھے پر تھپکی دے کر کہا۔

"مگر اتنے دولت مند ہونے کے باوجود انہیں اپنے خاندان میں کوئی لڑکی کیوں نہیں دیتا"۔ بیگم زینت نے کچھ خدشہ ظاہر کیا۔

"دیکھ لیا، تم صرف ایک عورت ہی ہو۔ یہ بھی سوچنے سمجھنے والی بات ہے۔ ان کی پسند پر کوئی لڑکی پوری نہ اترتی ہو گی"۔

"مزہ بہت آئے جب کہ کسی نہ کسی طرح نصیر اور زرینہ کی رسم نکاح ادا کر دیں تا کہ کہیں یہ مال دار لوگ ہاتھوں سے نہ نکل جائیں۔ دوسرے پھر اسلم کی آمد کا بھی ڈر ہے۔

"آ گیا تو پھر کیا ہو گا"

"کل نصیر کی والدہ صاحبہ یہاں آ رہی ہیں۔ تم اپنی عقلمندی کو کام میں لا کر نکاح پر زیادہ زور دینے کی کوشش کرنا۔ اور یہ کہنا کبھی نہ بھولنا کہ رشتے تو بہت

ملتے تھے۔ مگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری بچی شیخوں کے گھرانے میں جائے
کیوں کہ ہم بھی شیخ ہیں یہ کام تم کرو۔ باقی کام میں خود بڑی حسن وخوبی سے انجام
دوں گا۔ اور یہ بھی یاد رکھو کہ زرینہ اب اسلم کو کبھی خواب میں بھی نہ دیکھ سکے گی"
شیخ انتظار حسین نے اٹھتے ہوئے کہا۔

بیگم زینت نے ہاں میں ہاں ملائی اور وہ دونوں آنے والے مہمانوں
کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

تیرھواں باب

لے وہ آئیں گھر میں ہمارے یہ خدا کی قدرت ہے ؛ کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں۔

"یہ تو بیگم امتیاز علی تو تشریف لے آئی ہیں۔ ان کے ہمراہ ان کی صاحبزادی ناہید بھی ہیں۔ میں ان معزز مہمانوں کو نیچے ڈرائینگ روم میں نہایت تزک و احتشام کے ساتھ بیٹھا آیا ہوں۔ اب تم جاکر نہایت سلیقے کے ساتھ رابطہ قائم کرلو۔ میں مہمان نوازی کے فرائض سرانجام دے لوں گا۔"

بیگم زینت مصنوعی مسکراہٹ چہرہ پر لائے خاص نازو انداز کے ساتھ ڈرائینگ روم میں داخل ہوئیں۔ بیگم امتیاز علی اور ناہید تعظیماً ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔

"میں آپ کا بڑی دیر سے انتظار کر رہی تھی۔ بیگم زینت نے کروٹ لیتے ہوئے

کہا۔

"اچھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دراصل گھر سے باہر نکلتے دیر ہو جایا کرتی ہے"۔

"بیٹی کیا تمہارا ہی نام ناہید ہے"۔

"جی ہاں! چچی جان"۔

"کس جماعت کا امتحان دے رہی ہو آجکل"۔

"جی! ایف۔ اے کا!!!"

"کیا امتحان ہو رہے ہیں"۔

"جی نہیں ابھی نہیں ایک ماہ بعد ہونے والے ہیں"۔

"تو بس پھر تمہارا امتحان ختم ہوتے ہی ہم بیاہ رچالیں گے اب چند دنوں کے اندر اندر ہم رسم نکاح ادا کر لیتے ہیں بیگم زینت نے بیگم امتیاز علی اور ناہید پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا"۔

"یہ تو ٹھیک ہی ہے۔ ۔ ۔ ۔ مگر وہ کہاں ہیں"؟

"وہ۔ ۔ ۔ کون۔ ۔ ۔ کیا مطلب۔ ۔ ۔ ہیں کچھ سمجھی نہیں۔ بیگم زینت نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ۔ ۔

"میرا مطلب۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان سے ہے" وہ بولی

"اوہو ہو! تمہارا مطلب بیٹی زرینہ سے ہے۔ ابھی آہی رہی ہو گی۔ اتنے میں زرینہ مٹھائی اور چائے کی ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہوئی

وہ سب خاموش ہو گئیں۔ بیگم امتیاز علی اور ناہید اسے اسی طرح ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے میں محو ہو گئیں۔ گویا اس کے چہرے سے کوئی عبارت پڑھ رہی ہوں۔

زرینہ نے میز پہ چائے کی ٹرے رکھتے ہوئے سب کو سلام کیا۔ وہ اسے بدستور گھور رہی تھیں جس سے زرینہ کے سینے میں ایک خلش ...... اٹھی ماں کا اشارہ پاتے ہی وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔ مگر دائیں طرف سے بیگم امتیاز علی نے کہا

ادھر آؤ بیٹی ... یہاں میرے پاس بیٹھو۔"

یہ سنتے ہی زرینہ کا دل دھک ..... دھک ... .. دھک کرنے لگا۔ اس کے دل میں ہزاروں قسم کے وہم وگمان پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ وہ شرم وحیا کا لبادہ اوڑھ کر آہستہ آہستہ قدم اٹھائے اس صوفے کی طرف بڑھی جس پہ بیگم امتیاز علی تشریف فرما تھیں۔ جب زرینہ نے مناسب جگہ پہ بیٹھنا چاہا۔ تو بیگم امتیاز علی نے فوراً اپنے دائیں طرف ہو گئی۔ اور اسے بائیں طرف بیٹھنے پہ مجبور کر دیا۔ اس طرح زرینہ کے دائیں طرف بیگم امتیاز علی اور بائیں طرف ناہید تھی۔ زرینہ ان دونوں کے درمیان سمٹ کر بیٹھی ہوئی کسی سوچ میں محو ہونے والی تھی کہ اسے بیگم امتیاز علی کی پتلی سی آواز نے چونکا دیا۔

" بیٹی زرینہ! تم نے کہاں تک تعلیم حاصل کر رکھی ہے؟

"جی! قیامِ پاکستان سے پہلے میں نویں جماعت میں پڑھتی تھی"۔ زرینہ نے دوپٹہ کو سر پہ درست کرتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ ناول بینی کا شغل رکھتی ہیں"۔ ناہید نے کہا۔

"جی! شغل تو نہیں رکھتی مگر پڑھ ضرور سکتی ہوں"

تھوڑے عرصے کے لیے کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ بیگم امتیاز علی اور ان کی صاحب زادی ناہید مزید سوال سوچنے میں سر کھپانے لگیں اور زرینہ یہاں سے فراری کی تدابیر سوچنے میں مشغول ہو گئی۔

جب بیگم امتیاز علی کوئی سوال تلاش کرنے میں ناکام رہیں۔ تو بے اختیار ان کے منہ سے یہ نکل پڑا۔

"تم تو خاموش ہو گئی ہو۔ زرینہ! کچھ ہم سے بھی باتیں کرو"۔

"کیا کروں بڑوں سے بڑوں کو باتیں کرنی چاہیئے"۔ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھی اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے باہر نکل آئی۔

"ماشاءاللہ! جیسا چاند سا دولھا ویسی چاند سی دلھن! بڑی ہی سلیقہ شعار اور تعلیم یافتہ لڑکی ہے میں اسے جلد ہی بیاہ کرلے جاؤں گی"۔

"آپ کی پسند کا شکریہ"۔ بیگم زینت آنکھیں جھپکتے ہوئے بولی۔

"آپ کل زرینہ کے ابا کو ہمارے ہاں بھیجیں۔ تاکہ وہ دونوں باہمی صلاح و مشورے سے مناسب تاریخ مقرر کرلیں اور رسمِ نکاح ادا کی جا سکے"۔

زرینہ نے یہ تمام الفاظ درمیان کی دیوار کے پاس کھڑے ہو کر سن لیے اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اس کے لیے پوری دنیا اندھیر ہو گئی۔ اسے کائنات میں غم، دکھ، درد، ناانصافی اور ظلم کے سوا کچھ بھی نظر نہ آیا۔ اسلم کی تصویر کے مختلف رخ اس کے دل و دماغ میں ابھرتے اور سمٹتے رہے۔

اس کے ذہن میں ایک سوال ابھرا۔ کیا اسلم ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا ہو جائے گا؟ ایک سوال جس کا جواب وہ نہ پاسکی۔ کیا انہوں نے اسلم کو دھوکہ دے کر میری محبت کو دھوکہ نہیں دیا؟ شادی کے نام پر مذاق! ایک دھوکہ! ایک فریب! اس کے ذہن میں کئی سوال ابھرے

وہ لرزتی اور کپکپاتی ہوئی بالائی منزل پر شیخ انتظار حسین سے اس شادی کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے دوڑی۔

"ابا جان! کیا نیچے اماں جان میری شادی کے متعلق باتیں کر رہی ہیں"۔

"تو اور کیا وہ اپنی شادی کے متعلق باتیں کر رہی ہیں"۔

"کیا آپ وہ وقت بھول چکے ہیں جب آپ نے اسلم کو چائے پلاتے ہوئے کہا تھا۔ کہ میں زرینہ کی شادی تم سے کرنا چاہتا ہوں۔ مگر ......"

"زرینہ! تم بہت بڑھتی جا رہی ہو!" شیخ انتظار حسین نے اس کی بات کاٹتے ہوئے بلند آواز سے کہا۔

"مجھے آگے بڑھنے کی اجازت آپ کے ان اقدام نے دی جس سے مجبور

ہو کر ہر لڑکی . . . . . . لڑکی نہیں رہتی۔ بلکہ ایک احتجاج رہ جاتی ہے۔
صرف احتجاج !

اسی اثناء میں بیگم زینت بھی اپنے مہمانوں کو رخصت کر کے اوپر گئی۔ اور کمرے میں قدم رکھتے ہوئے بولی۔

"کیا ہے زرینہ کیا تمہیں اپنے باپ کے سامنے بولتے ہوئے شرم نہیں آتی ؟ اگر اب تم نے کوئی آواز نکالی۔ تو میں تمہاری زبان نوچ لوں گی۔"

چودھواں باب

دوسرے دن شیخ انتظار حسین خوب بن سنور کر صبح ہی سیٹھ امتیاز علی کے بنگلے پر جا دھمکے۔ سیٹھ امتیاز علی نے نصیر کی تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دیئے۔ اور شیخ انتظار حسین نے اپنی زرینہ کی تعریفوں کے ڈھیر لگا دیئے۔

جب ہر دو کی تعریفیں ختم ہوتی گئیں تو وہ دونوں اپنے مطلب کی طرف آتے رہے یہاں تک کہ آنے والی اتوار کو بعد از دوپہر بوقت چار بجے رسم نکاح ادا کرنے کی تاریخ معین ہو گئی۔

جب شیخ انتظار حسین آخری سلام کر کے چلتے بنے تو نصیر نے ان کی کرسی پر ٹیک لگاتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

"ابا جان! کیا آپ میری شادی کے متعلق باتیں کر رہے تھے؟"

تو اور کیا میں اپنی شادی کے متعلق باتیں کر رہا تھا" سیٹھ امتیاز علی نے عینک کے سفید چشموں سے موٹی موٹی خشم آلود آنکھیں نمودار کرتے ہوئے جواب دیا۔

" ابّا جان! مجھے یہ شادی منظور نہیں "

" کیا کہا! برخوردار نصیر!!! آخر وہ کیا وجہ ہے جس سے تم ہمارے فیصلے کو ٹھکرا رہے ہو "

" میں ایک نوجوان ہوں" . . . .

" میری نظروں میں تم ایک بچے ہو! " سیٹھ امتیاز علی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

" میں ہر بات اچھی طرح سے سمجھتا ہوں "

" مگر میری نظروں میں تم ابھی تک بے سمجھ ہو "

" میں یہ اچھی طرح سے سمجھتا ہوں کہ اس دنیا میں ہر نوجوان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی پسندیدہ عورت کو بیوی بنائے اور ہر عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جسے چاہے اپنا خاوند بنا لے "۔

" مگر آج تک ایسا ہوتا تو نہیں دیکھا "

" **شادی**! چند گھڑیوں اور چند دنوں کی بات نہیں ہوتی بلکہ اس شادی کے ساتھ دو دھڑکتے ہوئے دلوں کی پوری زندگی اور آئندہ آنے

والی نسلوں کی بقا وابستہ ہوتی ہے اس لیے یہ اسی صورت میں کامیاب رہ سکتی ہے جب دو دل خود بخود آپس میں مل جائیں۔"

"کوئی بھی اپنے بیٹے کا دشمن نہیں ہوتا۔ ہر آدمی سوچ سمجھ کر محبّت کے رشتے استوار کرتا ہے پرسوں اتوار کو تمہارے نکاح کی رسم ہے سمجھے!!"

"مگر میں تو اس شادی پر احتجاج کر رہا ہوں۔"

پھر تو تمہیں یہ دعا مانگنی چاہیئے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے۔ تمہارے ماں باپ اس دنیا کو الوداع کہہ کر آخری گھر کو سدھار جائیں تاکہ تم آزاد ہو سکو۔"

"میرا مطلب وہ نہیں جو آپ سمجھ گئے۔"

"میں تمہارا ہر مطلب اچھی طرح سے سمجھتا ہوں۔ کیونکہ میں نے تمہیں اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا تھا۔ اس لیے اگر میں تمہارا مطلب نہ سمجھوں تو کیا میرا باپ قبر سے اٹھ کر سمجھے گا۔ تمہیں پرسوں چار بجے اپنی شادی کے لیے تیار رہنا پڑے گا۔ ورنہ میں ہر وہ قدم اٹھا لوں گا جو مجھے کبھی نہیں اٹھانا چاہیئے۔"

"کیا آپ کا یہ آخری فیصلہ ہے؟" نصیر نے باہر جاتے ہوئے پوچھا

"نہیں پہلا فیصلہ ہے! بے شرم!! بے حیاء کہیں کا!!! سیٹھ امتیاز علی نے عینک کے چشمے صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔

نصیر بڑبڑاتا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔ تو بیگم امتیاز علی آدھمکی۔

"کیا کہہ رہا تھا بیٹا نصیر آپ سے!"

"نصیر نے کیا کہنا ہے ابھی بیوقوف ہے وہ بیچارا"

"مگر پھر... میں بھی کچھ جانوں" بیگم امتیاز علی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا

"........ کہہ رہا تھا کہ مجھے یہ شادی منظور نہیں۔ مجھے اپنی شادی خود کرنے کا حق دیا جائے"

"یہ تو واقعی بیوقوف ہی نکلا۔ یہ جانتے ہوئے کہ اس سے پہلے اس کی تین بار سگائی اس قسم کی باتوں سے ٹوٹی ہے۔ اس کی ایسی باتیں سن کر خواہ مخواہ ان لوگوں کو شک گزر گیا اور انہوں نے یہ کہہ کر جواب دینے شروع کر دیئے کہ ہمیں نصیر کے چال چلن پر شبہ ہے"۔

"پہلے تو نہیں مگر اب میرا شبہ بھی بڑھتا جا رہا ہے۔

اس نے ضرور کوئی........."

"...... نہیں...... نہیں میرا نصیر کبھی ایسا نہیں ہو سکتا۔ ویسے ہی وہ ذرا بیوقوف سا ہے" بیگم امتیاز علی بات کاٹتے ہوئے بولی

"یہ تو خدا کی بڑی کرم نوازی ہے کہ وہ خود چاہتے ہیں کہ رسم نکاح فوراً ادا کر دی جائے۔ ورنہ پھر ہمیں اس بات پہ زور دینا پڑتا۔ نصیر کی گذشتہ تین بار سگائی نے ہمیں یہ نصیحت دی ہے کہ لمبی

سگائی کبھی سودمند ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ لڑکی والے لڑکے کے کردار کی دیکھ بھال کرنے لگ جاتے ہیں۔ جس سے ذرا سا شک بھی یقین میں تبدیل ہو جاتا ہے۔"

"**آپ** بجا فرماتے ہیں۔ میں تو نکاح ہوتے ہی برات پر زور دوں گی۔"

"نہ۔۔۔ نہ۔۔۔۔۔ نہ ایسی غلطی کبھی نہ کرنا کیونکہ آخر جہیز کو بنتے بنتے بھی کچھ عرصہ لگے گا۔ یہ بات انہی کی مرضی پر چھوڑ دو۔"

پندرھواں باب

رحیم، کریم اور سلیم نصیر کے لنگوٹیے یار تھے۔ یہ تینوں نصیر کے پاس ملازم تھے۔ شام کو سب اکٹھے ہوتے اور رات کے بارہ بارہ بجے تک آوارہ گردی کرتے رہتے۔ یہ سب ایک جیسی ذہنیت کے مالک تھے اور ان سب کا مقصد نصیر کو بُرے راستوں پر لگا کر اس کی زیادہ سے زیادہ دولت کو حاصل کرنا تھا۔ نصیر نے ان کاموں میں مہارت پاکستان بننے سے بھی پہلے "پریم نگر کالج" کے زمانۂ طالب علمی میں حاصل کر رکھی تھی۔ اس لیے انہیں نصیر کو بگاڑنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ نصیر اپنا ہر راز انہیں بتا دیتا اور ہر معمولی سے معمولی اور بڑے سے بڑے کام کے متعلق ان ہی سے مشورہ لیتا۔ نصیر نے حسبِ معمول عادت اپنے نکاح کے بارے میں بھی ان سے مشورہ لیا ان سب

نے متفقہ طور پر یہی رائے دی کہ نکاح تو ایک رسم ہے ادا کرلو اس کے بعد ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت شادی کرنے سے انکار کر دینا۔ اتنے عرصے میں تم کافی سے زیادہ روپیہ اپنے نام پر دوسرے بنکوں میں جمع کرا چھوڑو کیونکہ اگر تمہارے باپ نے تمہیں اپنی جائیداد سے بے دخل بھی کر دیا تو تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچ سکے۔

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اتوار بھی آگئی حتیٰ کہ وہ وقت بھی آگیا جب کسی کی یہ آواز اس کے کانوں میں پڑی :۔

"برخوردار نصیر! کیا تم انتظار حسین قوم شیخ سکنہ حال لاہور کی صاحبزادی زرینہ بیگم کو حق مہر بتیس روپے شرعی عندالطلب اپنے حق میں لینا قبول کرتے ہو؟"

"جی مجبور ہوں"

"کیا مطلب ؟"

"قبول ہے"

ایک بھونڈی سی آواز کمرے میں گونجی۔ اور اس کے بعد مبارک ہو ...... مبارک ہو...... مبارک ہو...... کی وہ بوچھاڑ ہوئی کہ توبہ ہی بھلی۔ آناً فاناً ہی چھواروں کی بارش ہوئی بزرگ ہستیاں تو پھر بھی صبر کا دامن ہاتھ میں پکڑے ہوئے بیٹھی رہیں۔ جن کی شادیوں

کو ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا وہ اسی چھوارے پر نگاہ اٹھا کر دیکھتے جوان کے قریب گرتا اور اسی کے بعد اسے اسی طرح پکڑتے جس طرح اولوں کی بارش میں بچے اولے پکڑا کرتے ہیں۔ "مگر کنوارہ پارٹی" نے چھواروں کی لوٹ گھسوٹ میں اتنا کمال کر دکھایا کہ مولوی صاحب کو مجبور ہو کر چھواروں کی بارش کا رخ عورتوں کی طرف کر دینا پڑا۔

نکاح کے بعد شیخ انتظار حسین نے بڑے احترام کے ساتھ اپنے ان مہمانوں کو یہ کہتے ہوئے رخصت کیا کہ

الٰہی کھلیں ان کی الفت کے پھول
مہر میں دلہن کے ہو دولھا قبول

رسم کے دو دن بعد شیخ انتظار حسین کو اسلم کا خط موصول ہوا۔ چنانچہ وہ بھاگتے ہوئے بیگم زینت کو بتانے کے لیے بالائی منزل پر اوپر آئے۔

"بیگم ...... بیگم ...... بیگم ...... وہ آرہا ہے۔"

"کون آرہا ہے؟"

"اسلم"... شیخ انتظار حسین نے ذرا زور دے کر کہا!

"اسلم آرہا ہے تو پھر میں کیا کروں۔"

"اجی کروں کا کام تو ہو جائے گا۔ بعد میں میرا مطلب یہ تھا کہ اسلم کا خط آیا ہے اور وہ خود کل آئے گا۔"

" آئے گا تو پھر دیکھا جائے گی"۔

" یہ بھی خدا کی بڑی مہربانی ہے کہ وہ کل آرہا ہے اور ہم اپنا کام ختم کر چکے ہیں۔ ورنہ پھر مشکل ہی تھا"۔

" اس میں کیا مشکل ہے وہ آئے گا تو میں سمجھا دوں گی"۔ بیگم زینت نے بڑی بے پرواہی سے جواب دیا"۔

اسلم نے راستے میں" دہلی میں چند روز "کے عنوان سے اپنے سفر کا حال ایک کتابچہ کی صورت میں لکھا۔ دوسرے دن شام کے قریب اسلم لاہور پہنچا۔ زرینہ نے اسے کھڑکی سے ہی آتا ہوا دیکھ لیا۔ اسلم اپنا کمرہ کھول کر ذرا ستانے کے لیے کرسی پر بیٹھ کر اپنے اس کتابچہ کا سرسری طور پر مطالعہ کرنے لگا کہ ایک دروازے سے بیگم زینت کمرے میں بڑی سنجیدہ صورت بنا کر داخل ہوئی۔ اسلم تعظیم کے لیے اٹھ کر آداب بجالایا بیگم زینت مسکراتے ہوئے بولی۔

بیٹا اسلم! تم یہ سن کر شاید خوش ہی ہو گے کہ ہم نے زرینہ کا نکاح بالکل تم جیسے ایک شریف لڑکے کے ساتھ کر دیا ہے۔ اس لیے میں تمہیں یہ کہوں گی کہ اب تم یہاں نہ آیا کرو"۔

یہ سنتے ہی اسلم کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ انہوں نے دہلی بھیج کر دیدہ و دانستہ مجھے دھوکہ دیا ہے مجھ سے فریب کیا ہے

مگر اس وقت غیر معمولی استقلال کا ثبوت دیتے ہوئے چہرے پر مصنوعی بشاشت ظاہر کرتے ہوئے اسلم نے کہا۔

"مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی ہے میری طرف سے آپ کو مبارک ہو"

اس کے بعد اسلم نے کمرے کے چاروں طرف حقارت بھری، نگاہوں سے دیکھا اور الٹے پاؤں کمرے سے باہر بھاگ گیا۔

ٹھیک اس وقت جب اسلم باہر کی جانب جارہا تھا پچھلے دروازے سے زرینہ نمودار ہوئی۔ اسے یوں باہر جاتا دیکھ کر وہ زور سے بولی "اسلم" مگر اسلم نے مڑ کر نہ دیکھا۔ جب وہ میز کے قریب آئی تو اسلم جا چکا تھا۔ میز پر ایک مسودہ پڑا تھا جس کے پہلے صفحے پر لکھا ہوا تھا۔

دہلی میں چند روز

زرینہ کے نام!

از

اسلم

یہ پڑھ کر زرینہ کے منہ سے بے اختیار نکل پڑا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسلم اور اس کے ساتھ ہی اس کے دونوں ہاتھ مسودہ کو اٹھا کر اس کے سینے کے ساتھ جا لگے۔ یہ دیکھ کر بیگم زینت کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اور وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔

"او! رسوائی کی بولتی ہوئی پتلی - بدنامی کی دہکتی ہوئی چنگاری - بے شرم ..... بے حیا..... خبردار

ے شرم کی زلفوں میں تجھکو منہ چھپانا چاہیئے
جسم نامحرم کی نظروں سے بچانا چاہیئے"

زرینہ کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور اس نے دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

ے درد مٹ جائے تو پھر میں شرح ملال کروں
گر اجازت ہو تو فی الحال اک سوال کروں

کیا آپ وہ وقت بھول گئی ہیں جب مجھے سکھ اٹھا کرلے گئے تھے۔ اس وقت تو تم دونوں صرف "میری زرینہ" ہی کہہ کر خاموش ہو گئے تھے۔ یہ اسلم ہی تھا جس نے اس وقت اپنے سر دھڑ کی بازی لگا کر آپ کے خاندان کی لاج رکھی"

"کیا تو اسلم کا پیچھا نہیں چھوڑے گی بے شرم؟" بیگم زینت تلملا اٹھی

"اسلم کا پیچھا میں کیسے چھوڑ سکتی ہوں جبکہ وہ میرے انگ انگ میں سما چکا ہے"

"خاموش رہو! ہم نے غلطی کی جو اسلم کو اپنے گھر میں رہنے کے لیے جگہ دے دی"

" مگر میں نے تو اسے اس وقت ہی اپنے دل میں جگہ دے دی تھی جب اس نے مجھے ظالم سکھوں کے چنگل سے چھٹکارا دلوایا تھا۔"

" تم بہت بڑھتی جارہی ہو زرینہ! تمہیں ابھی تک اتنا بھی علم نہیں کہ تم کس کے سامنے باتیں کر رہی ہو۔"

" مجھے سب کچھ علم ہے میں اس نادان ماں کے سامنے بول رہی ہوں۔ جو دنیا کی سب سے بڑی احسان فراموش عورت ہے۔"

" بکو مت...... بدتمیز!"

" کیا آپ وہ وقت بھول گئی ہیں جب آپ نے اسلم کو یہ کہا تھا کہ بیٹا! ہم تمہارا کس منہ سے شکریہ ادا کریں۔ ہم تمہارا یہ احسان ساری عمر نہیں بھولیں گے۔ مگر ابھی تین سال بھی بڑی مشکل سے گزرنے پائے تھے۔ کہ اسے یوں گھر سے نکال دیا جیسے وہ ایک چور......... ڈاکو اور بدمعاش تھا۔"

" وہ بدمعاش نہیں تو اور کیا تھا یہ کہاں کی شرافت ہے کہ وہ ایک شریف لڑکی کو اپنی محبت کے جال میں پھنساتا رہا۔"

" اور یہ کہاں کی شرافت تھی کہ ایک شریف لڑکی کو بدمعاش اٹھا کر لے جائیں۔ لڑکی کے ماں باپ کھڑے تماشا دیکھتے رہے اور وہ بدمعاشوں کا مقابلہ کر کے ان کے خاندان کی عزت کو بچائے۔"

"یہ واقعہ تو ایک ناگہانی آفت تھی۔ جو ٹل گئی۔ اسلم کی وساطت سے ٹل گئی ... ورنہ قدرت اس کے سینے کوئی اور ہی سبیل پیدا کر دیتی۔"

"کاش کہ آپ سمجھ سکتیں کہ قدرت نے اسلم کو ہی آپ کی سبیل بنا کر بھیجا تھا"

"تو پھر ہم نے اس وقت بھی اسلم کا شکریہ ادا کر دیا تھا اور اب بھی اس کے شکر گزار ہیں۔"

"ہوں! اتنی بڑی خدمت کا صلہ! صرف شکریہ!! کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ اس شکریہ کو بھی اپنے پاس ہی رکھتیں"

"تم نے باتیں بنانی ہیں۔ جتنی جی چاہے بنا لو۔"

"میں باتیں نہیں بناتی۔ میں آپ سے صرف اپنے دل کی آواز کا جواب مانگتی ہوں کہ

اسلم کہاں ہے؟"

اتنے میں شیخ انتظار حسین بھی کمرے میں آموجود ہوئے اور بغیر موقعہ کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے بولے :۔

"بیٹی زرینہ! دراصل امر واقع یہ ہے کہ اسلم کا اس دنیا میں کوئی نہیں"

"اگر اس کا یہی قصور ہے تو میں سمجھتی ہوں وہ بے قصور ہے۔" زرینہ نے یک لخت کہا!

سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی آہٹ ہوئی۔ شیخ انتظار حسین اسے دیکھنے کے لیے سیڑھیوں کی طرف جھانکنے لگے اور بات نہ چل سکی۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ سب چپ ہو گئے۔ شیخ انتظار حسین، نزہینہ اور بیگم زینت!

سولھواں باب

اسلم ٹرین سے اترتے ہی جب گھر پہنچا تو اس کا تھکن سے برا حال تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی لباس تبدیل کر کے ذراستانے کے لیے آرام کرسی پر لیٹ گیا تھا۔ وہ اپنے دماغ کی کوفت کو دور کرنے کے لیے دہلی میں چند روز کا مسودہ پڑھنا چاہتا تھا مگر اس کا دماغ گردشِ لیل و نہار کی طرح زرینہ کی محبت کے محور کے گرد چکر کاٹ رہا تھا۔ اس کے دماغ میں کئی قسم کے وہم و گمان ابھرتے جو سگریٹ کے دھوئیں کی طرح واضح ہو کر پھر رفتہ رفتہ زائل ہو جاتے۔

"نہیں...... نہیں...... یہ سب وہم غلط ہیں میری شادی جلد ہی زرینہ سے ہو گی۔ شیخ انتظار حسین مجھے بے حد پسند کرتے ہیں اگر انہیں مجھے

اپنا داماد بنانا مقصود نہ ہوتا تو مجھے ہرگز اپنے گھر نہ رکھتے۔ انہوں نے دفتر میں بھی مجھے اچھی سے اچھی پوسٹ دلوانے کی بارہا کوشش کی تھی جو اس بات کا ثبوت ہے ان کی یہ سب سے بڑی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح مجھے میرے والدین مل جائیں جس سے شادی بھی بڑی شان و شوکت سے ہو اور زرینہ کے سر پر ہمیشہ اس کے سسرال کا سایہ رہے۔ مگر افسوس اسلم کی آواز پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکی۔ میں آج کھانا کھا کر گہری نیند سو جاؤں گا۔ تاکہ صبح اٹھنے تک تھکاوٹ دور ہو سکے۔ صبح کو جلدی سے تیار ہو کر دفتر چلا جاؤں گا۔ تاکہ دفتر میں شیخ صاحب سے ملاقات کی جائے اب میں مزید صبر نہیں کر سکتا۔ میرا پیمانۂ صبر لبریز ہوتا جا رہا ہے۔ میں بہت جلد زرینہ کو حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ آخر ہم کب تک سنہری سپنے دیکھتے رہیں گے۔ میں کل انہیں یقین دلاؤں گا کہ میں ایک فرمانروا داماد بن کر رہوں گا۔ میں جب انہیں کہوں گا کہ میرے اوصافِ حمیدہ پر آپ ہمیشہ فخر کیا کریں گے تو وہ یقیناً جواب میں مسکرا کر کہیں گے۔ مجھے تم سے یہی امید ہے میں تمہیں ایک سعادت مند بیٹا سمجھتا ہوں پھر میں کوئی بہانہ بنا کر گھر آ کر زرینہ کو یہ خوش خبری سناؤں گا۔ وہ خوشی سے پھولی نہ سمائے گی۔ اس کے نرم پتلے اور دلکش ہونٹ مسکرا کر کئی زاویے بنائیں گے۔ اور اس کے دیدہ زیب رخسار سرخ سے سرخ تر ہوتے جائیں گے اس

وقت میں اسے کہوں گا۔ میری زرینہ! تو وہ مسکرا کر اپنے خوبصورت ہونٹوں کو جنبش دیتے ہوئے جواب دیگی۔ ہم عنقریب ایک ہونے والے ہیں۔

اسلم جاگتے میں یہ خواب دیکھ رہا تھا اس کا دل بے حد بیقرار تھا۔ کہ کسی نہ کسی طرح اس خواب کی جلد سے جلد تعبیر بھی دیکھ لے.. مگر بیگم زینت بے وقت کمرے میں آدھمکی۔ اسلم نے بیگم زینت کے چہرے پر غیر معمولی بشاشت دیکھ کر اپنے دل کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ اُف...... یہ لمحات کتنے غضبناک تھے۔ جب بیگم زینت نے اسے بتایا کہ ہم نے زرینہ کا نکاح تم جیسے ایک لڑکے سے کر دیا ہے۔ وہ یہ کیا سن رہا تھا۔ اس کا کلیجہ چھلنی چھلنی ہو گیا۔ کیا زرینہ ہمیشہ کے لیے اس سے جدا کر دی گئی۔ ایک ایسا سوال جس کا وہ کوئی جواب نہ ڈھونڈھ سکا "اب تم یہاں نہ آیا کرو" ایک پتلی سی نسوانی آواز ہوا میں لہراتی ہوئی اس کے کانوں میں پڑی۔ اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس کا خون کھولنے لگا۔ اس کے جذبات بڑھنے شروع ہوئے اس کے دل میں اس گھرانے کے خلاف نفرت کی لہر اٹھتی اور بڑھتی رہی۔ ایک دھوکہ...... ایک فریب...... سچائی کے ساتھ جھوٹ...... ہمدردی کی آڑ میں بے ایمانی...... چند خیالات جو اس کے دماغ میں ابھرے اور ابھرتے گئے"۔

"اسلم! تمہیں دھوکہ دیا گیا ہے" "اسلم! تم یہاں فریب کا شکار ہوئے ہو"

"اسلم! اس گھرانے میں تمہارے لیے کوئی ہمدردی نہیں" اسلم! اب تو تمہیں انہوں نے گھر سے نکل جانے کا بھی حکم دیا ہے"

اسلم نے اپنے دل کی دھڑکن کی آواز کو وقت سے پہلے سن لیا۔ اسلم اسی وقت اپنا تمام مختصر سا اثاثہ انہیں کے گھر چھوڑ کر تیز تیز قدم اٹھائے۔ ان کے گھر سے نکل آیا۔

جب وہ اسی راستے سے گھر آیا تھا۔ تو وہ تھک کر چور ہو چکا تھا مگر جب وہ انہیں قدموں پر واپس آرہا تھا۔ تو اس میں ایک طرح کی نئی چستی پیدا ہو چکی تھی وہ جوش و خروش ولولے اور جذبے سے سرشار غم و غصے کا سہارا لیکر جارہا تھا۔

اسلم کے سینے میں زرینہ کے خلاف انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ زرینہ نے یقیناً میرے ساتھ بے وفائی کی ہے وہ میرے ساتھ عشق و محبت کی پینگیں بڑھا کر محبت کا مذاق اڑاتی رہی ہے اس نے میری محبت سے جتنے بھی وعدے کئے تھے۔ سب جھوٹ اور لغو تھے۔ اگر وہ چاہتی تو مجھے وقت سے پہلے بتا سکتی تھی تاکہ میں دہلی جا کر پندرہ دن تک خراب نہ ہوتا۔ وہ مجھ سے نہیں۔ بلکہ اپنے ماں باپ سے محبت کرتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی ماں کی محبت کا اشارہ پاتے ہی اپنی ماں کے آگے جھک گئی۔

اسلم اسی قسم کی باتیں اپنے دل میں سوچتا رہا۔ انار کلی سے گذر رہا تھا۔

جہاں عورتوں اور مردوں کا بے پناہ رش تھا شام کا سہانا سماں تھا اور انارکلی کا بازار جہاں ہر شام ہزاروں کی تعداد میں عورتیں خوب بن ٹھن کر سیر و تفریح اور خرید و فروخت کے لیے نکلتی ہیں جہاں ہر شام عورتیں محض اس لیے آتی ہیں تاکہ وہ نت نئے فیشن کی علمبردار بن کر دوسری عورتوں کو حسد کی آگ میں جلا سکیں۔

ایسے بازار میں عورتیں نئے سے نئی مخملی پھولدار ساڑھیاں پہن کر آتی ہیں جہاں عورتیں عہدِ اکبری کے وقت کے غرارے پہن کر آتی ہیں تاکہ دیکھنے والوں کو دعوتِ نظارہ دے سکیں جہاں صرف انہیں عورتوں کی محنت کی داد دینے کے لیے ہزاروں کی تعداد میں لوگ سیر کے لیے آتے ہیں۔

مگر اسلم کا دل عورتوں سے متنفر ہو چکا تھا اس کی جب کبھی نظر تین فرلانگ زمین میں پھیلے ہوئے غرارے والی کسی عورت پر پڑی۔ تو وہ اپنی نظر دوسری طرف کر لیتا۔ اور جب دوسری طرف اس کی نظر..ں ایک پھولدار ساڑھی والی کو ایک صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے کسی کا منتظر پاتیں تو وہ فوراً کہہ اٹھتا۔ یہ سب بکواس ہے۔ . . . . دھوکہ ہے . . . . فریب ہے نئی روشنی کے پردے میں بے حیائی ہے وہ وائی۔ ایم۔ سی۔ اے میں آیا۔ جہاں ایک مرد اور عورت ٹیبل بال کھیلنے میں مصروف تھے اور کئی لڑکے اس عورت کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے بھی

تھے۔ اور بغیر کسی مقصد کے قہقہے لگا کر تالیاں بھی لگاتے تھے۔ دو دل کھیل رہے تھے۔ مگر کئی دل مسرت و شادمانی کے ترانے گا رہے تھے۔ اسلم انہیں ایک نظر دیکھ کر باہر آ گیا۔ اب وہ مال روڈ پر تھا۔ پھر وہ جی۔پی۔او کے بس سٹاپ کے قریب آیا۔ جہاں سے اس کا ارادہ بس سے لارنس گارڈن جانے کا تھا۔ مگر جونہی وہ بس سٹاپ کے قریب سے قریب ہوتا گیا اس کے کانوں میں یہ آواز پڑی :۔

"اچھا اب میں چلتا ہوں پھر کل ملاقات ہو گی۔۔ خدا حافظ"۔۔۔۔۔

"خدا حافظ مگر بس کے آنے تک تو آپ ٹھہریں"

اسلم نے ایک لڑکے اور دو لڑکیوں کو دیکھا جنہوں نے سیاہ برقعے تو اوڑھے ہوئے تھے مگر نقاب اٹھائے ہوئے تھے اسلم کو دیکھتے ہی یکدم ان لڑکیوں نے نقاب گرا دیئے۔ اسلم ان سے تھوڑی دور جا کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ لڑکا بھی چلا گیا جس سے یہ باتیں کر رہی تھیں۔ اس لڑکے کے جاتے ہی ان دونوں میں سے ایک لڑکی اسلم کے قریب آئی اور پوچھا

"بس کب آئے گی" ؟

"مجھے کیا معلوم"، اسلم نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

اتنے میں دوسری لڑکی بھی نقاب اٹھا کر آ گئی اور آتے ہی بولی۔

"اس وقت کیا بجا ہوگا؟"

تم مجھے یہاں نہیں کھڑے ہونے دو گی" اسلم نے پورے غصے کے ساتھ کہا "عجیب بیوقوف معلوم ہوتے ہو" دوسری بولی

"تم سب بکواس ہو۔ اسلم نے تھوڑی دور چل کر ٹیڑھی نظر سے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہاری ماں بکواس ہے ... تمہاری بہن بکواس ہے" ان دونوں نے غراتے اور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اسلم پیدل ہی لارنس گارڈن کی طرف چل رہا تھا مگر جوں جوں اس میں جوش کم ہوتا گیا۔ توں توں وہ ہوش سے ہوتا گیا۔ وہ تھکاوٹ اور بھوک کو تیزی سے محسوس کرنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا سر درد سے چکر کھا رہا ہے وہ سٹینڈرڈ ہوٹل میں جا کر پیٹ کی آگ بجھائے۔ پھر اسے خیال آیا کہ کہیں وہ اپنی نقدی والا پرس ان کے گھر ہی تو نہیں بھول آیا۔ اس مقصد کے لیے اس نے گھبرا کر اپنی جیبوں کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔

"یہ بھی اچھا ہوا کچھ رقم میں نے اس قمیض کی جیب میں ڈال لی تھی ورنہ پتہ نہیں کیا ہوتا ...." اس نے آہستہ سے اپنے دل سے باتیں کرتے ہوئے کہا اس نے ابھی اپنا یہ فقرہ پورا بھی نہیں کیا تھا۔ کہ

سٹینڈرڈ ہوٹل کے دروازے پر چسپاں اشتہار کو پڑھنے لگا۔ لکھا تھا:

TO DAY 6-30 P.M

TUNEFUL

DELIGHTFUL

AND

ENTERTAINING PROGRAME

BY

ZARINA (PESHAWRARI)

RIGHTS OF ADMISSION-RESERVED.

~~اسلم~~ اسے پڑھتے ہی بول اٹھا پھر زرینہ! ہنیں۔۔۔۔۔ ہنیں ۔۔۔ میں زرینہ کو ہنیں دیکھنا چاہتا۔ یہ سب بکواس ہے۔ دھوکہ ہے۔۔۔۔۔۔ فریب ہے۔

زرینہ کا نام پڑھ کر اس کے دل کے تمام زخم از سر نو ہرے ہو گئے۔ وہ ابھی ابھی گزرے ہوئے واقعات سے پھر پیچ وتاب کھانے لگا۔ زرینہ کے خلاف اس میں نفرت کا جذبہ بڑھتا گیا۔ وہ زرینہ سے اس قدر متنفر ہو چکا تھا کہ اس کا نام تک اپنی آنکھوں سے پڑھنا اسے گوارہ ہنیں تھا۔ سٹینڈرڈ ہوٹل کے ساتھ ہی بس سٹاپ تھا۔ وہ اس بس میں بیٹھکر واپس

انار کلی میں آیا۔ "دہلی مسلم ہوٹل" میں اس نے کھانا کھایا اسے اس شدت سے بھوک ستا رہی تھی کہ کھانا کھانے کے دوران میں وہ ان تمام واقعات کو بھول گیا جن سے وہ حال ہی میں دوچار ہوا تھا۔ جب وہ کھانا کھا چکا تو اس کے کانوں میں بیگم زینت کے الفاظ گونجنے لگے۔ جن الفاظ نے انہیں یہاں تک پہنچا دیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سے ماضی کے تمام واقعات یکے بعد دیگرے پھر گھومنے لگے وہ کرسی کو ذرا پیچھے کی طرف سرکا کر ٹیک لگاتے ہوئے کچھ سوچنے میں محو ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہوٹل کے بہرے نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"بابو صاحب؟"

"اچھا! پہلے تم جا کر ایک کپ چائے لاؤ اس نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا" سب سے پہلا اور آخری سوال جو اس کے ذہن میں چھپیاں لے رہا تھا۔ وہ یہ تھا کہ آخر وہ جائے تو جائے کہاں۔ اسے آج پہلی بار احساس ہوا تھا کہ اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں رہا۔ چائے پی کر اس کی طبیعت قدرے سنبھل گئی اور وہ کچھ سکون محسوس کرنے لگا۔

جب وہ بل دے کر کرسی سے اٹھا تو اس نے اپنے پیٹ کو بھاری پایا۔ اس کی ٹانگیں اگرچہ کافی سے زیادہ درد کر رہی تھیں۔ مگر پھر بھی وہ بازار میں یونہی گھومنے کے لیے نکلا انار کلی میں عورتوں اور مردوں کا ہجوم کم ہو

چکا تھا۔ تاہم دوکانوں پر اب بھی تنگ پیٹی والی قمیض اور گلے میں رسی کی مانند بل دیا ہوا دوپٹہ والی خواتین اپنی ضروریاتِ زندگی کی چیزیں خریدنے میں مشغول نظر آتی تھیں۔ اسلم آہستہ آہستہ قدم اٹھائے جا رہا تھا چونکہ ٹانگیں چلنے سے معذور تھیں۔ اس لیے پھر لوٹ آیا اور پھر اس نے دہلی مسلم ہوٹل میں اپنے قیام کے لیے ایک کرایہ کے کمرہ کا انتظام کر لیا۔

ستارھواں باب

دوسرے دن اسلم دفتر پہنچا۔ اس کا خیال تھا۔ کہ شیخ انتظار حسین اسے اپنے پاس بلائیں گے یا اسے خود ملنے کے لئے اس کے کمرے میں آئیں گے بارہ بج گئے مگر اس کی امید بر نہ آئی۔ وہ یہ دیکھنے کے لیے آیا کہ شیخ انتظار حسین دفتر میں ہیں۔ یا چھٹی پر جا چکے ہیں۔ شیخ انتظار حسین کے کمرے کے قریب کھڑا ہو کر اسلم انہیں ایک نظر سے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہ اچانک ایک چپڑاسی خلاف توقع اسلم کے قریب سے نکلا۔

" ایئے ایئے! بابو اسلم یہاں کیسے کھڑے ہیں آپ !!"

" کیا شیخ صاحب اندر ہیں" اسلم نے یونہی متفکرانہ لہجے میں کہا۔

" جی ہاں وہ اندر ہی ہیں۔"

"کیا کر رہے ہیں"۔ اسلم نے چپڑاسی سے یونہی بے سوچے سمجھے سوال کیا۔
"وہی جو پہلے کیا کرتے تھے"۔ چپڑاسی نے فائلیں دیکھتے ہوئے جواب دیا
"اچھا اب تم کہاں جا رہے ہو"۔
"جناب میں فائلیں دینے جا رہا ہوں آج آپ اندر کیوں نہیں جاتے؟"
"بس میں ابھی جاتا ہوں"۔ اسلم نے اپنا رخ دوسری طرف کرتے ہوئے جواب دیا۔ چپڑاسی کی روانگی کے بعد اسلم نے اندر جانے کے لیے بارہا کوشش کی۔ مگر ہر بار اس کے ارادوں کو پسپا ہونا پڑا۔ اس نے کئی بار ہمت جرأت کو بڑھا کر اندر کی طرف قدم بڑھائے مگر ہر بار اس کے ارادوں نے اس سے پوچھا۔

اسلم تو اندر جا کر کیا کرے گا؟ تو اندر جا کر کیا کرے گا۔ کیا پوچھے گا؟ انہوں نے تو مجھے گھر سے نکال دیا ہے تاکہ اب تو انہیں کبھی نہ مل سکے۔ تیرے پاس کوئی عذر بھی تو نہیں۔ کوئی بہانہ نہیں.. کوئی کام نہیں... جب تک کام نہ ہو۔ بڑے لوگ نہیں ملا کرتے۔

نہیں... نہیں...... نہیں... اس سے پہلے میں متعدد بار یہاں آتا رہا۔ شیخ صاحب ہمیشہ خوش خلقی سے پیش آئے۔ انہوں نے کئی بار مجھے کہا کہ میں تمہیں اپنا داماد بنانا چاہتا ہوں۔ گو اب انہوں نے اپنے خیالات تبدیل کر لیے ہیں۔ تاہم وہ مجھے ضرور پہچانیں گے وہ میرے ساتھ

ہرگز وہ سلوک نہیں کریں گے جو بیگم زینت نے کیا ہے۔ آخر شیخ صاحب میرے بزرگ بھی ہیں اور افسر بھی!" اسلم نے اپنے دل کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

اتنے میں چپڑاسی ڈاک لیکر آگیا۔ اسلم نے اس سے ڈاک لیکر کہا یہ لو ایک روپیہ ذرا جلدی سے ایک سیٹ چائے لے آؤ۔ چپڑاسی چائے کے لیے دوڑا اور اسلم آہستہ آہستہ قدم اٹھائے خطوط کو الٹ پلٹ کرتا شیخ انتظار حسین کی میز کے سامنے جا کر رک گیا۔ شیخ انتظار حسین نے اسے دیکھتے ہی فوراً نظریں نیچے میز پر گاڑ دیں اور اپنے کام میں یوں ہمہ تن گوش ہوئے جیسے وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھے ہوں۔ اسلم کبھی ان کی طرف دیکھتا اور کبھی ان خطوط کو الٹ پلٹ کر کے ان پر لکھے ہوئے اڈریس ذرا بلند آواز سے پڑھتا۔ مگر شیخ انتظار حسین نے آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا۔ جب کافی وقت یونہی بیت چلا۔ تو اسلم نے ایک ایک کر کے تمام چٹھیوں کو میز پر پھینکنا شروع کر دیا۔ شیخ انتظار حسین کے پاس اب درازیٔ زبان کے بغیر کوئی چارہ نہ رہا۔ چنانچہ انہوں نے آنکھوں سے چشمہ اتار اور ماتھے پر مصنوعی شکن ڈالتے ہوئے گرجدار آواز سے کہا۔

"تم کیوں خواہ مخواہ میرا وقت ڈسٹرب کر رہے ہو"

"میں ڈاک دینے کے لیے آیا ہوں۔ سر!"

"مگر میں نے تو چپڑاسی کو ڈاک لینے کے لیے بھیجا تھا"

"جی آپ بجا فرماتے ہیں۔ مگر میں نے اسے ذرا ایک کام بھیجا ہے"۔

"تم بڑے عجیب آدمی معلوم ہوتے ہو۔ چپڑاسی وہ میرا ہے اور کام تم اسے اپنے بھیجتے ہو"

"چلیئے معاف کیجئے، کوئی بات نہیں ہم بھی تو آپ ہی کے ہیں"۔ اسلم نے ذرا طنزیہ کہا۔

شیخ انتظار حسین سے جب کوئی جواب نہ بن پڑا تو انہوں نے لفافوں کو چیر پھاڑ چٹھیوں کو پڑھنا شروع کر دیا اتنے میں چپڑاسی چائے لیکر آگیا۔ اسلم نے چائے پیالیوں میں انڈیل کر ایک چائے کا کپ شیخ انتظار حسین کے آگے سرکاتے ہوئے کہا

"پہلے ذرا چائے پی لیجئے"۔

"نہیں . . . . نہیں میں چائے نہیں پیا کرتا"۔ شیخ صاحب نے منہ بسورتے ہوئے جواب دیا۔

"مگر پہلے تو آپ متعدد بار چائے پیا کرتے تھے"۔

"دراصل زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ مجھے بھی بدلنا پڑا۔ اس لیے اب میں نے چائے کی بجائے دودھ پینا شروع کر رکھا ہے"۔

"بہت خوب مگر میرے خیال میں تو آپ زمانے کی رفتار سے بھی جلدی

بدل گئے ہیں ویسے یہ آپ نے بہت اچھا کیا جو دودھ پینا شروع کر دیا۔ کیونکہ چائے گرم اور خشک ہوتی ہے اسلم نے چائے کا ایک لمبا گھونٹ لے کر کہا۔

"بہت اچھا ڈاکٹر صاحب اب آپ جا سکتے ہیں"

"میرے خیال میں آپ نے مجھے پہچانا نہیں" اسلم نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا

"تم کون ہو" شیخ صاحب میز کے نیچے دیکھتے ہوئے گرجے

"میری طرف دیکھیے میں کون ہو سکتا ہوں"

"میں کئی بار تمہیں دیکھ چکا ہوں" شیخ انتظار حسین نے فائلیں درست کرتے ہوئے کہا۔

"میرا نام اسلم ہے۔ جسے آپ شاید بھولانے کی کوشش کر رہے ہیں"

"میں جانتا ہوں تم اسلم ہو۔ مگر اب تم یہاں سے چلے جاؤ"

"جا تو رہا ہوں۔ لیکن میں آپ کو یہ بتانے کے لیے آیا تھا کہ میں دہلی سے ہو کر آیا ہوں۔ مگر زینہ کے سسرال کا کوئی پتہ نہیں چلا"

یہ سن کر شیخ انتظار حسین غصہ میں بھر گئے اور گرجتے ہوئے بولے۔

"کیا تمہیں ایک آفیسر کے سامنے یوں گستاخانہ گفتگو کرتے ہوئے شرم نہیں آتی"

"آتی ہے پر نہیں آتی" اسلم نے ذرا مسکرا کر کہا

"عجیب بدتمیز معلوم ہوتے ہو کچھ سمجھ ہی نہیں" "تو پھر فرمائیے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔

"صرف یہی کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ اور پھر کبھی نہ آؤ"

"جا تو رہا ہوں۔ لیکن . . . ."

"میں کچھ سننے کے لیے تیار نہیں بہتر ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ پھر مجھے چپڑاسی کی مدد لینا پڑے گی" شیخ انتظار حسین نے غصے سے لال ہوتے ہوئے کہا۔

"حضور آخر اتنی تکلیف کیوں کرتے ہیں میں جاتا ہوں۔ پھر کبھی ملاقات ہو جائے گی"

جونہی اسلم نے دو چار قدم اٹھائے۔ شیخ انتظار حسین بولے۔

"اسلم! ذرا رکو"

"جی ارشاد"

"میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں۔ کہ میرا اسٹاف ہر وقت یہ دیکھ کر پیچ و تاب کھاتا رہتا ہے کہ مجھ جیسے اعلیٰ افسر کے تم جیسے کلرک کے ساتھ تعلقات کیوں ہیں اس لیے اب تم یہاں نہ آیا کرو۔ کیونکہ اس میں میری اور تمہاری عزت ہے"

"مگر آپ نے اپنے سٹاف کو یہ کیوں نہ بتایا کہ مجھے آپ کے داماد ہونے کا فخر حاصل رہا ہے"

"اسلم! میری نظروں سے فوراً دور ہو جاؤ۔ ورنہ میں تمہیں آفس سے نکال دوں گا" شیخ انتظار حسین نے چیختے ہوئے کہا۔

"آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر" اسلم یہ کہہ کر تیز تیز قدم اٹھاتے کمرے سے باہر آگیا۔

اٹھارھواں باب

اسلم کی روانگی کے بعد شیخ انتظار حسین کچھ وقت تک گہری سوچ و فکر میں ڈوب گئے اور اس کے بعد اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ اسلم نے اپنے کمرے میں آکر میز پر رکھی ہوئی فائیلوں کو درست کیا۔ کچھ وقت ادھر ادھر کی گپتیں ہانکنے میں صرف کیا پھر طبیعت کی خرابی کا بہانہ لگا کر نصف دن کی چھٹی لے کر چلا آیا۔ وہ یونہی پھرتا پھراتا مال روڈ سے ہوتا ہوا میکلوڈ روڈ آیا۔ اس وقت تمام سینماؤں کے بڑے دروازے کھل چکے تھے۔ سینماؤں کی دوکانیں سجائی جا رہی تھیں۔ اور بھنگی تماشائیوں کے حفظانِ

صحت کی خاطر صفائی کرنے میں مصروفِ عمل نظر آرہے تھے بکنگ کلرک اپنے اپنے بکنگ آفس کے دروازے کے باہر کرسیوں پر بیٹھ کر سینما کی ٹکٹوں پر حکومت کے ٹیکس کی ٹکٹیں چسپاں کر رہے تھے اسلم وقت گذارنے کی خاطر ہر سینما کے اندر جاتا۔ سینما میں جس فلم کی نمائش ہو رہی ہوتی تھی۔ اس فلم کے متعلقہ ایکٹر اور ایکٹرس کی تصاویر جو دیواروں کے ساتھ لٹکی ہوئی تھیں۔ دیکھ کر واپس آجاتا۔ اس طرح اس نے میکلوڈ روڈ کے ہر سینما کا معائنہ کر لیا۔ تمام ایکٹر اور ایکٹرسوں کی تصاویر اپنی آنکھوں میں اتار لیں۔ انہیں اچھی طرح سے جان اور پہچان لیا۔

اَب وہ میکلوڈ روڈ سے ہوتا ہوا لبنت روڈ پر آ گیا تھا اس کے سینے میں اب پھر وہی ارمان سلگنے لگے۔ مگر ان کے ساتھ اس کے دل میں نفرت کا جذبہ بھی بڑھتا گیا۔ وہ کبھی زرینہ کو بے قصور ٹھہراتا اور کبھی اسے بے وفا کے مختلف خطبات سے نوازتا رہا۔ آج اس کا دل یہ گواہی دے رہا تھا کہ زرینہ بے قصور ہے۔ وہ مجبور تھی جبکہ ہر لڑکی اپنے ماں باپ کی آغوش میں مجبور ہوا کرتی ہے۔ وہ ہرگز بے وفا نہیں ہو سکتی۔ اس کی مجبوری نے اسے بے وفا بننے پر مجبور کر دیا۔ وہ اپنے دل میں ایسے ہی اختلافات رکھتے ہوئے شیخ انتظار حسین کے گھر کے نزدیک آتا رہا۔ جوں جوں وہ ان کے گھر کے نزدیک آتا رہا۔ توں۔ توں زرینہ کے متعلق اس کے خیالات

بدلنے کے ساتھ ساتھ پریشان بھی ہوتے رہے۔

شیخ انتظار حسین کے گھر کی عقبی دیوار سڑک کے کنارے تھی اس کے علاوہ اس عقبی دیوار کے عین درمیان میں بالائی منزل پر ایک کھڑکی تھی اسلم دور ہی سے اس کھڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کھڑکی میں ایک عورت کھڑی بازار کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی سرخ رنگ کی پھولدار قمیص اور سفید دوپٹہ جو اس نے اپنے چہرے کے گرد اچھی طرح سے لپٹا ہوا تھا۔ اسلم کو دور سے ہی دکھائی دے رہا تھا۔

"ہو نہ ہو یہ بیگم زینت ہو گی" اسلم نے اپنے دل کو یقین دلاتے ہوئے کہا۔ مگر جونہی وہ اور قریب آیا اسلم کی ان لگاوٹ کی نگاہوں سے یہ راز کھلا کہ وہ بیگم زینت نہیں تھی بلکہ ایک لڑکی تھی۔۔۔ زرینہ ۔۔۔ صرف زرینہ ۔۔۔ اسلم کی بے وفا زرینہ ! اسلم کا خیال تھا کہ وہ اسے دیکھتے ہی فوراً پیچھے ہٹ جائے گی۔ مگر جس رفتار سے اسلم اس کے قریب آتا رہا، اسی رفتار سے زرینہ اپنے چہرے کو آگے کرتے ہوئے ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے کی کوشش کرتی رہی۔ آج اسلم کے دل میں ماضی کی وہ یاد تازہ ہوئی جب اسلم نے سب سے پہلی مرتبہ زرینہ کو دیکھا تھا سب سے پہلی مرتبہ زرینہ کے گھر ہندوستان میں گیا۔ آج بھی اسلم اس کے سامنے کھڑا ہو رہا تھا۔ آج بھی وہ دونوں ایک دوسرے کو اسی طرح ٹکٹکی باندھ کر دیکھ

رہے تھے۔ جس طرح سب سے پہلے انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ جب اسلم زرینہ کے بہت قریب آگیا تو زرینہ نے دل کو تسلی دیتے ہوئے اپنے آپ کو مطمئن پایا اور معمولی سی مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے اسلم کو گھر آنے کا پیغام دیا۔

یہ پیغام موصول کرتے ہی اسلم کے دل میں اگرچہ خوشی کی ایک کرن پھوٹ پڑی جس نے اس کے سینے کے تاریک بادلوں کو اپنی روشنی سے منوّر کرنے کی حتی الامکان کوشش کی مگر ناکام رہی۔ تاہم اسلم، زرینہ کے بلاوے پر اس کے گھر گیا۔ زرینہ اسلم کو اپنے سامنے کھڑا دیکھتے ہی مسکرائی۔ مگر اسلم سنجیدہ صورت بنائے غمِ جاناں و غمِ دوراں کے صدمے کا بار اٹھائے کھڑا رہا۔

"کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں" ؟ زرینہ نے سنجیدہ صورت بناتے ہوئے کہا۔

"نہیں.... زرینہ! مجھے تم سے کوئی گلا نہیں...... کوئی شکایت نہیں" یہ کہتے ہوئے اسلم نے اپنی نظریں زرینہ سے پھیر لیں۔

"آپ مجھ سے بولتے کیوں نہیں"۔ زرینہ اسلم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ اسلم نے اپنا رخ زرینہ کی طرف کرتے ہوئے کہا

ے وفا تجھ سے اے بے وفا چاہتا ہوں
میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

ذرینہ یہ سنتے ہی جھنجھلا اٹھی :-

ے کی وفا ہم نے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

"بہت خوب! اب تو تم شاعرہ بنتی جا رہی ہو میری طرف سے نہیں اور تمہارے والدین کو مبارک ہو۔"

"نہ آپ شاعر نہ میں شاعرہ - اس لیے آپ کی بات وزن نہیں رکھتی۔"

"جاؤ ذرینہ! تمہاری اماں جان تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر ناراض ہوں گی"

"وہ پہلے مجھے آپ کے ساتھ دیکھ کر کیوں ناراض نہیں ہوا کرتی تھیں۔"

"اس کے صحیح جواب کا تو تمہیں ہی علم ہوگا۔

"مگر میں جواب دینے میں ہمیشہ غلطی کی مرتکب ہوا کرتی ہوں" "تو پھر سمجھ لو انہیں دوسرا داماد پسند آگیا ہے۔"

"کاش میری ماں جانتی کہ اسلم کے بغیر ان کا کوئی داماد نہیں بن سکتا۔"

"جاؤ زرینہ! اب یہ باتیں کسی اور سے کرو۔ میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔ جتنا تم مجھے سمجھ رہی ہو۔" اسلم بولا۔

"اس کا یہ صاف مطلب ہے کہ آپ غلط فہمی کا شکار ہو چکے ہیں آپ

یہ سمجھ چکے ہیں کہ زرینہ بے وفا نکلی ۔ میں آپ کو کیسے یقین دلواؤں کہ زرینہ مر جائے گی مگر آپ سے ہرگز بے وفائی نہیں کرے گی "۔

" زرینہ ! عورت ہمیشہ جذبات کی رو میں بہہ کر بات کیا کرتی ہے اور بات کرنے سے پہلے ہرگز نہیں سوچتی کہ اس بات کا انجام کیا ہوگا "

" مجھے اپنے انجام کا اچھی طرح سے علم ہے یا تو میں تمہاری ہو جاؤں گی یا پھر ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے ختم ہو جاؤں گی "۔

" زرینہ ! مجھ سے ایسی باتیں کہہ کر میرے دل کو تسلی دینے کی کوشش نہ کرو ۔ ضرورت پڑنے پر میں خود اپنے دل کو تسلی دے دوں گا "۔

" دراصل سب سے مشکل بات تو یہ ہے کہ مرد جب کسی بھی غلط فہمی کا شکار ہو جائے ۔ تو پھر کسی بھی ممکن طریقے سے اسے یقین نہیں دلوایا جا سکتا " میں آپ کو کیسے باور کراؤں کہ جس دن آپ دہلی گئے ۔ اس سے پہلی رات میں نے کیسی مشکل سے گذاری ۔ اس رات مجھے ان کی تمام سازش کا علم ہو گیا ۔ میں نے ہر ممکن طریقہ سے آپ کے پاس آنے کی کوشش کی مگر کیا کرتی ۔ دائیں بائیں ماں اور باپ کے پہلوؤں سے جکڑی ہوئی تھی اور ان کی تیز نظروں کے ہاتھوں نظر بند تھی ۔ ساری رات بیدار رہی ۔ مگر جس وقت آپ کے کمرے میں داخل ہوئی ۔ آپ جا چکے تھے ۔ اندازہ لگائیے ! اس وقت میری کیا حالت ہوئی ہوگی اور اس وقت میری دنیا کس قدر تاریک اور ڈراونی ہوئی ہوگی

جب میرے کان ان الفاظ سے مزین ہوئے ہوں گے۔ کہ کیا سیٹھ امتیاز علی ذم شیخ سکنہ لاہور کے فرزند ارجمند دجگر کے پیوند شیخ نصیر کو بہ حق مہر بتیس روپے شرعی عندالمطلب اپنے حق میں لینا قبول کرتی ہو۔

اب آپ بتائیں اس وقت میری زندگی۔ تنزل و انحطاط کی کتنی منزلیں طے کر چکی ہو گی اور میرے لمحات یاس و قنوط کی کس قدر گھڑیوں سے دوچار ہوئے ہوں گے۔ یقین جانیئے! میں اپنی پوری قوت سے چیخی۔ چلائی۔ تڑپی۔ اور تڑپتی رہی۔ مگر میری آواز ظلم و بربریت کے گنبدوں سے ٹکرائی۔ مگر افسوس! اس کے آگے نہ جا سکی۔ میں اس وقت بھی کہتی تھی۔ اب بھی کہتی ہوں۔ اور آنے والے وقت میں بھی کہوں گی۔ کہ آپ ہیں میرے سرتاج .... میں نے آپ کو اپنا سرتاج بنایا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ نہ میں نے آپ کو اپنا بنایا نہ آپ نے مجھ کو اپنا بنایا۔ بلکہ ہم دونوں کا رشتہ قدرت نے ایک بنایا ہے۔ لہذا ہم ہر ظلم کے ہاتھوں سے قدرت کے اس بنائے ہوئے رشتہ کو محفوظ رکھیں گے"

"زرینہ! میں یہ اچھی طرح سے سمجھ چکا ہوں کہ تمہارا اس میں کوئی قصور نہیں .... تم بالکل بے قصور ہو .... بالکل میری طرح سے .... میں نہیں چاہتا کہ تم میری وجہ سے اپنی زندگی جان جوکھوں میں ڈال لو۔ اس لیے اب ہمیں ایک دوسرے کو بھول جانے کی کوشش

کرنی چاہیئے۔"

"آخر کیوں بھول جانے کی کوشش کروں؟" زرینہ نے تلملاتے ہوئے کہا۔

"صرف اس لیے کہ انہوں نے اب تمہارا نکاح کسی دوسرے کے ساتھ پڑھا دیا ہے اب میری تمہاری شادی نہیں ہوسکتی زرینہ!"

"آخر کیوں نہیں ہوسکتی! کیا میرے لیے طلاق اتنی ضروری نہیں جتنا نکاح ضروری تھا۔"

زرینہ! تم میرے لئے آخر اتنی بڑی قربانی کیوں کر رہی ہو۔

"صرف اس لئے کہ آپ میرے سرتاج ہیں۔ آپ میرے ہیں۔ آپ ہیں وہ جن کی ہوں میں آ۔

" اچھا زرینہ اب تم جاؤ کہیں ایسا نہ ہو۔ تمہاری والدہ نیچے آکر ہمیں دیکھ لے۔" اسلم نے تھوڑی سی گھبراہٹ محسوس کرتے ہوئے کہا۔

" کوئی فکر نہ کریں۔ والدہ گئی ہوئی ہیں ایک لمبے دورے پر! لیعنی ہمارے خاندان میں ایک تھا" میں نشے میں ہوں" وہ بہت شراب پیتا تھا اور آخر کثرتِ شراب نوشی سے اس کے پھیپھڑے پھٹ گئے اور وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اس لئے اماں جان اس کی روح کو ثواب پہنچانے گئی ہیں۔"

"کہیں شیخ صاحب نہ آجائیں۔ کیوں کہ چار بجا چاہتے ہیں"۔ اسلم نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا پھر تو آپ کو ضرور چلنا چاہیئے۔ آپ کی نشانی" دہلی میں چند روز" مجھے مل گئی تھی۔ یادآوری کا شکریہ ! یہ لیجیئے انگوٹھی اسے میری نشانی سمجھیئے۔ ہماری نکاح کے وقت مجھے پہنائی گئی تھی۔"

" اگر تمہاری والدہ نے اس کے بارے میں پوچھا۔ تو کیا جواب دو گی"

جواب کا کیا ہے۔ معمولی سا دے دوں گی۔ کہ گم ہو گئی ہے۔ ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔"

" نہیں زرینہ! یہ تمہارے نکاح کی انگوٹھی ہے۔ تمہیں کو مبارک ہو۔

آپ اتنے فکرمند کیوں ہوتے ہیں۔ جب میرا آپ سے نکاح ہوگا۔ اس وقت آپ مجھے پہنادیں۔"

" اچھا اب پھر میں کب آؤں"

ہر رات میری خواب میں ضرور آیا کیجئے اور آنے والی اتوار کو آنا نہ بھولنا۔ کیوں کہ سیٹھ صاحب بمبئی ہیں اس لیے یہ دونوں تیمارداری کے لیے جائیں گے۔ میں اس وقت کھڑکی میں ہی آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ اور اب اتوار کو آپ ہی کی راہ دیکھوں گی۔ اس لیے اب جائیے خدا حافظ"

" خدا حافظ زرینہ"

اُنیسواں باب

زرینہ رات کو اسلم کے خواب و خیال میں سوئی۔ چنانچہ نیند کا غلبہ آنے کے فوراً بعد اس نے اسلم کو خواب میں دیکھا۔ زرینہ ایک بنگلے کی بالائی منزل پر ایک خوبصورت کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ جہاں خوبصورت خوشنما طرز جدید کے صوفہ سیٹ پڑے ہوئے تھے۔ دلکش قالین بچھے ہوئے تھے۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر دیدہ زیب پردے لگے ہوئے تھے جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ رنگ برنگ کی چھوٹی چھوٹی بتیاں جلتی ہوئی بھلی معلوم دے رہی تھیں۔ زرینہ کروٹ بدلتے ہی بیدار ہوئی اور اس کے بعد اس نے کئی کروٹیں بدلیں

سینکڑوں انگڑائیاں لیں مگر وہ دوبارہ نیند کی آغوش میں نہ سو سکی۔ زرینہ اٹھتے ہی سنگار میز کے سامنے ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ سب سے پہلے اس نے اپنے نرم نیلے اور دلکش ہونٹوں پر سرخی کا موٹا موٹا لیپ چڑھایا۔ رخساروں پر غازے کی تہہ جمائی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو کاجل سے مزین کیا سر کے بالوں پر طرح طرح کی مانگیں بنائی اور قسم قسم کے پھولوں سے سنوارا۔ پھر اس نے ایک شیشے کی الماری کھولی جو کئی قسم کے قیمتی سے قیمتی سینٹوں کی چھوٹی چھوٹی خوبصورت شیشیوں سے بھری ہوئی تھی۔ زرینہ نے ہر شیشی کے سینٹ سے اپنے لباس کو معطر کیا۔ اب زرینہ پھر سنگار میز کے بڑے شیشے کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔

"آج میں کتنی خوبصورت نظر آ رہی ہوں"۔ زرینہ نے شیشے میں اپنے عکس کو بڑے تیکھے انداز میں خطاب کرتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد اس نے ایک اور شیشے کی بڑی الماری جو اس کمرے کے دائیں کونے میں کھڑی تھی۔ کو کھولا۔ اس میں سے رنگ برنگ کوٹ نکالے اور ان میں سے سرخ رنگ کے کوٹ کو پسند کر کے پہنا اور سنگار میز کے سامنے آکر کوٹ کے بٹن بند کرنے لگی۔

"نہیں۔۔۔ نہیں اس کوٹ سے میری خوبصورتی میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ یہ مجھے اتار دینا چاہیئے!"

زرینہ نے بڑی جھنجھلاہٹ کے ساتھ اس کوٹ کو اتار پرے پھینکا۔ شیشے کی الماری جیکٹوں اور کلوکوں سے بھری پڑی تھی۔ سرخ رنگ کی کلوک کو وہیں کھڑے کھڑے فوراً پہنا۔ اسی الماری کے شیشے سے وہیں کھڑے کھڑے اس کا جائزہ لیا۔

" نہیں! یہ بھی مجھے اچھی طرح معلوم نہیں ہوتی"۔

اب اس کی نظر اس کے لباس پر پڑی۔ وہ سرخ رنگ کے سوٹ کو زیب تن کئے ہوئے تھی۔ یہی خوشنما سوٹ اس نے اپنے نکاح کے وقت پہنا تھا وہ کافی وقت تک کلوکوں کے رنگوں کا جائزہ لیتی رہی آخر اسے سبز رنگ کی ایک کلوک پسند آ ہی گئی۔ اس کے کناروں پر دو۔ دو انچ کی چوڑی دھاگوں سے پھولدار بیل بنی ہوئی تھی۔ وہ اس کو پہن کر پھر دوبارہ اس سنگار میز کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ اس نے پھر سنگار میز کے شیشے میں اپنے عکس کو دیکھ کر خطاب کیا۔

" زرینہ! آج تم اتنی خوبصورت کیوں دکھائی دے رہی ہو!!!

زرینہ نے پاس کی کھڑکی کے پھولدار پردے کو اپنے ہاتھ سے پرے سرکا کر کھڑکی کھولی۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر فضا کا جائزہ لیا۔ ٹھنڈی اور بھینی بھینی ہوا کے جھونکوں سے دماغ معطر ہوا چاہتا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے آسمان کے تارے اسے مسکراتا ہوا دیکھ کر خود بھی مسکرا رہے ہیں۔

آج چاند اپنے پورے شباب پر ہے اس سے قبل اس کی اس قدر چمک دمک کبھی بھی دیکھنے میں نہ آتی تھی۔ کہیں یہ میری خوبصورتی سے متاثر ہو کر اپنے آپ کو اتنا خوبصورت تو نہیں ظاہر کر رہا۔" ذرینہ نے اپنے دل سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔

چاند واقعی بڑا روشن تھا اس کی روشنی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ چاند کی یہ سب کرنیں بجلی کے کھمبوں کے تاروں کی طرح ایک دوسرے سے مل کر کھڑکی کے ذریعے کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ ذرینہ نے اپنی خوبصورت بھویں خوبصورت چہرے کے ساتھ اوپر اٹھائیں وہ چاند کی روشن کرنوں میں اپنا عکس دیکھ کر شرما رہی تھی۔ چاند کی روشن کرنوں میں اضافہ ہوتا گیا اور اس کی آنکھیں اتنی بڑی روشنی کو دیکھ کر چندھیانے لگیں ذرینہ نے اپنی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا کہ چاند میں ایک مرد کا چہرہ نمودار ہو رہا ہے۔ آہستہ آہستہ چاند کا دائرہ وسیع سے وسیع ہوتا گیا اس میں اسے ایک بہت ہی خوبصورت مینڈھا دکھائی دیا۔ اس مینڈھے کا سر بہت چھوٹا۔ ٹانگیں چھوٹی اور پتلی رنگ دودھ کی مانند سفید آنکھیں بالکل سیاہ اور اس کی کھال کے بال سفید اور لمبے تھے۔ اس کی کھال کے بالوں کی لمبائی مرد کی لمبائی سے بھی زیادہ تھی۔ ذرینہ نے دیکھا کہ مینڈھے نے اس مرد کو اپنی خوبصورت سفید چمکتی ہوئی کمر پر سوار کر لیا ہے۔ مسکراتے اور جگمگاتے ہوئے ستاروں

نے اس مینڈھے کے لیے سیج بچھا دی۔ چاند کی کرنیں اس کے لیے اوراجاگر ہو گئیں۔ وہ چاند کی روشن کرنوں میں کھو گیا۔ . . . .

چاند کی روشنی میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس کی روشن کرنیں اجاگر ہوتی گئیں۔ ستارے مسکراتے رہے روشنی بکھرتی گئی۔ فضا رقص کرتی رہی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ بہت بڑے باغ میں کھڑی ہے جہاں کی ہر ایک چیز اپنے پورے شباب پر ہے جہاں کے پھول اور پودے رقص کر رہے ہیں۔ ہوائیں جھومتی ہوئی آرہی ہیں اور اپنے ساتھ سارے گلستاں کی خوشبو لا رہی ہیں دیکھتے ہی دیکھتے وہ قریب آتا گیا۔ زوردار ہوائیں چلنے لگیں۔ پودے اپنے خوشنما پھولوں کے ساتھ لمبی لمبی انگڑائیاں لینے لگے۔ درخت جھومتے ہوئے دوہرے ہونے لگے۔

بہار آتی رہی زرینہ کا دل دھڑکنے لگا۔ اس کی آنکھیں پھڑکنے لگیں۔ اس کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے زور زور سے بجنے لگے۔ ان پر لگے ہوئے پردے اڑنے لگے۔ اب روشنی اس قدر بڑھ چکی تھی۔ کہ زرینہ آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکی۔ اس کی آنکھیں بند ہوتی گئیں اس نے اپنے دونوں ہاتھ ماتھے کے اوپر سائے کے لئے رکھ لیئے تب اس کی آنکھیں کچھ دیکھنے کے قابل ہو سکیں۔ اس نے مینڈھے پر بیٹھے ہوئے مرد کو آنکھ بھر کر دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ سفید شیروانی سفید شلوار اور سفید چپل میں ملبوس ہے۔ جب وہ اس کے بہت ہی قریب آگیا۔ تو

وہ اسے دیکھتے ہی چیخی۔

"او۔۔۔۔۔۔ یہ تو میرا اسلم ہے!"

وہ منڈھا کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہو کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں مسکراتے رہے۔

"اسلم! تم یہاں!!!" زرینہ نے مسکراتے ہوئے نہایت اچھوتے انداز میں کہا۔

"زرینہ! تم کہاں!!!" اسلم نے مسکراتے ہوئے اسی اچھوتے انداز میں جواب دیا۔

"اسلم! تم یہاں کیا آئے! اپنے ساتھ سب بہاروں کو بھی لیتے آئے۔" یہ کہتے ہوئے زرینہ نے اپنی دونوں باہیں اسلم کے کندھوں پر رکھ دیں۔

زرینہ! میں آتی دفعہ تمہارے لیے صرف ایک بہار لے کر آیا۔ آؤ میں تمہیں دکھاؤں۔ کہ تمہارے سنہری سپنوں کے سرتاج نے اپنے شیش محل میں کس قدر بہاروں کو چھپا رکھا ہے۔"

اچھا پہلے یہ بتاؤ میں آج کیسی دکھائی دے رہی ہوں۔

"بہت خوبصورت۔۔۔۔۔۔ اس سے بھی زیادہ خوبصورت دکھائی دو گی"

مگر اسلم! میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی" زرینہ نے غمزدہ ہو کر کہا۔

"کیوں۔۔۔۔ آخر کیوں۔۔۔ مجھے جلدی بتاؤ زرینہ" اسلم متفکر ہو کر بولا۔

"اسلم تمہیں کیا بتاؤں۔ اباجان نے میرے تمام راستے بند کر دیے ہیں انہوں نے مجھے اپنی آغوش میں قید کر لیا ہے وہ مجھے تمہیں دیکھنے بھی نہیں دیتے۔ انہوں

نے میرے کمرے کے تمام دروازوں کو تالے لگا دیئے ہیں۔ وہ ہر وقت میری نگرانی کرتے ہیں۔"

"میرے پاس آؤ زرینہ! میرے پہلو میں آؤ! اب تمہیں میرے پہلو سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ آج اسلم پہلا سا اسلم بن کر نہیں آیا بلکہ آج وہ زرینہ اور صرف زرینہ کا اسلم بن کر آیا ہے۔"

"کیا تم سچ کہتے ہو۔ اسلم" زرینہ نے کمزور آواز میں پوچھا۔

"زرینہ! مجھے بتاؤ میں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں"۔ اسلم نے اسے اپنے قریب لاکر کہا۔

"بس اسلم! مجھے تم پر پورا اعتماد ہے آج سے زرینہ تمہاری ہے اور تم میرے ہو۔ چلو آؤ کہیں بھاگ جائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو ابا جان جاگ پڑیں۔ یہ کہتے ہوئے زرینہ اسلم سے لپٹ گئی۔

"زرینہ! تم میرے ساتھ اس گلستان میں جا رہی ہو جہاں بہاریں تمہیں ایک بار اپنی آغوش میں لینے کے بعد پھر کبھی واپس نہ آنے دے گیں۔ بہتر ہے۔ تم وہاں جانے سے پہلے ایک بار اپنے ماں باپ کو دیکھ لو"

میں اپنے چمن کی بہاریں صرف اسلم کو دیکھنا چاہتی ہوں تم ہو میری آنکھوں کے نور۔ تم ہو میرے دل کے سرور جلدی کرو میرے سرتاج! ہم جلدی سے ان بہاروں سے جا کر لپٹ جائیں جہاں ہمیں کوئی نہ دیکھ سکے"۔

یہ کہتے ہوئے زرینہ نے اپنی باہیں اسلم کی باہوں میں پیوست کرتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کی کمر کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"زرینہ! کیا تم وہاں جا کر پھر مجھے واپس آنے کے لیے تو نہیں کہو گی؟" اسلم نے اس کی گرفت سے آزاد ہوتے ہوئے اپنے ہاتھ سے اس کے ماتھے سے بال ہٹا کر کہا۔

"اسلم! تمہاری بہاروں سے ہمکنار ہو کر پھر کون خزاں کی طرف آئے گا۔"

اسلم نے زرینہ کو اپنے ساتھ مینڈھے پر بٹھا لیا۔ مینڈھا ان دونوں کو لے کر پھر کھڑکی کے راستے باہر کھلی فضا میں نکلتے ہی آسمان کی طرف پرواز کرنے لگا۔

اس نے ان دونوں کو ایک وسیع و عریض عالیشان گلستان میں اتار دیا اور خود غائب ہو گیا۔ اس گلستان کے درمیان سنگِ مرمر کا ایک عجیب و غریب مرصع خوبصورت تالاب کی صورت میں بنا ہوا تھا۔ اس تالاب کے پانی کا رنگ کچھ ایسا تھا جسے انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس میں سنہری مچھلیاں تیرتی پھرتی تھیں اور اس تالاب کے درمیان ایک بہت بڑا مور اپنے پَر پھیلائے کھڑا تھا۔

اس کی چونچ سے پانی فوارہ کی صورت میں نکل کر تالاب کے سامنے والی دیوار پر گر رہا تھا۔ اس دیوار پر ایک چھوٹا سا سفید سنگِ مرمر کا تخت بنا ہوا تھا۔ جو کسی صورت میں بھی تختِ طاؤس سے کم نہ تھا۔ وہ دونوں اس تخت پر جا کر کھڑے

ہو گئے۔ اس گلستان کے ایک کونے میں ایک نہایت ہی خوبصورت کوٹھی بنی ہوئی تھی۔ اسلم نے اس کوٹھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"زرینہ! تمہارا اس شیش محل کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"بہت بہت ہی اچھا خیال ہے مگر اسلم کہیں ہمیں یہاں کوئی دیکھ تو نہیں لے گا۔

"زرینہ! یہاں تمہاری ساس رہتی ہے۔ نہ تمہارا خسر اور نہ کوئی اور"

"ہمیں ایک ایسا شیش محل بنانا چاہیئے۔ جہاں اسلم اور زرینہ کے علاوہ کوئی نہ ہو"

"زرینہ! یقین جانو!! اس شیش محل میں! اس گلستان میں اور اس سامنے والی پہاڑوں کی وادی میں ہمارے علاوہ اور کوئی نہیں۔"

وہ دونوں اس تخت پر بیٹھ گئے۔ زرینہ نے اس کے پہلو میں بیٹھ کر اسلم کو اپنی دونوں باہوں کی مضبوط گرفت میں لیتے ہوئے کہا۔

"یہ گلشن . . . یہ تالاب . . . . . . یہ پھل . . . . . . یہ پھول . . . . یہ پودے اور یہاں کی ہر چیز نرالی ہے۔"

اسی تالاب میں تیرتی ہوئی مچھلیاں پریاں بن گئیں اور وہ قطار وار ہو گئیں

زرینہ چیختی ہوئی بولی

"اسلم! کیا تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟"

"زرینہ! میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا" اسلم نے زرینہ کے ماتھے پر

پھر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

سب کے بعد ایک پری تالاب سے نکلی۔ وہ پری قد میں ان سب پریوں سے بڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دو ہار اور دوسرے ہاتھ میں سونے کا ایک کٹورہ تھا۔ وہ کٹورہ دودھ سے بھرا ہُوا تھا۔ جب وہ تخت کے پاس آئی۔ سب پریاں تخت سے اتر گئیں اور تعظیم کے ساتھ اسے ایک ساتھ سلام کیا۔ اس نے آتے ہی اس کٹورے سے باری باری دونوں کو دودھ پلایا اور اس کے بعد ایک ایک ہار ان دونوں کے گلے میں ڈال دیا۔ سب پریوں نے اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں کھول کر ان پر پھولوں کی بارش کی آنِ واحد میں وہ ان کا تخت لیکر اڑ گئیں اور انہیں ایک بہت ہی بلند پہاڑ کی چوٹی پر جاکر کھڑا کیا یہ پہاڑ بھی اپنی خوبصورتی کے لحاظ سے ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اس کے چاروں طرف خوبصورت وادیاں تھیں۔ باغ تھے۔ قطعے تھے... پھل تھے... پھول اور پودے تھے۔ مگر اس پہاڑ کی چوٹی کے مغربی جانب کچھ بھی نہیں تھا۔ بستی تھی صرف پستی اور اس کے ہزاروں میل نیچے پانی ہی پانی تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی قدرے نیچے ایک پودا تھا۔ جس سے ایک بہت بڑا سرخ گلاب کا پھول اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ کھلا ہُوا تھا۔ اس پودے تک پہنچنے کے لیے سرخ پتھر کی سیڑھی بنی ہوئی تھی۔ زرینہ نے اس پھول کو دیکھ کر اسلم کی کمر پر پھر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اسلم! یہ پھول کس قدر خوبصورت ہے"۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ زرینہ! جب میں یہ پھول توڑ کر تمہارے ان بالوں میں لگاؤں

گا۔ تو تم بہت خوبصورت دکھائی دو گی۔ بہت ہی خوبصورت ...... اس سے بھی زیادہ خوبصورت!"

"نہیں...... اسلم! تم گر جاؤ گے۔"

"کیسے گروں گا زرینہ! یہاں اترنے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔" اسلم نے زرینہ کا ہاتھ پرے ہٹا کر کہا۔

"نہیں..... اسلم! مجھے ڈر لگ رہا ہے تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے" زرینہ پھر اسلم کے ساتھ بری طرح لپٹ گئی۔

"میں تمہیں چھوڑ کر کہاں جاؤں گا۔ زرینہ میں تمہارا ہوں اور تم میری ہو۔" یہ کہتے ہوئے اسلم سیڑھیاں اترنے لگا۔ مگر جونہی اس نے اس پھول کو پکڑا۔ اسلم کا ہاتھ ساکن ہو گیا۔ اس نے دوسرا ہاتھ لگایا تو وہ بھی اس کے ساتھ جڑ گیا حتیٰ کہ اسلم اس پودے کے اندر دھنس گیا۔ اسی وقت اس پودے کے ساتھ کئی اور پھول کھلے جب اسلم کا سارا چہرہ ان پھول سے مزین ہو گیا۔ تو پھولوں نے نیچے پستی کی طرف سفر کرنا شروع کر دیا۔ اسلم نے فوراً چیختے ہوئے آواز دی۔

"مجھے پکڑو زرینہ! میں جا رہا ہوں۔"

یہ سنتے ہی زرینہ نے وہیں کھڑے کھڑے چھلانگ لگا دی۔ اسلم نے اپنی دونوں باہیں پھیلا کر زرینہ کو پکڑتے ہی اپنے سینے سے لگا لیا اور وہ دونوں اس پانی میں گر کر ڈوب گئے۔ زرینہ نے ڈر کر کروٹ بدلی تو وہ چارپائی سے نیچے زمین پر گر پڑی

وہ سرہانے کو اپنی دونوں نرم نرم اور سفید باہوں سے پکڑے اپنے سینے کے ساتھ لگائے ہوئے تھی۔

"اُف . . . . . توبہ . . . کتنا حسین . . . . . ہیبت ناک . . . . .

اَور ڈراونا خواب تھا۔

بیسواں باب

آج پھر اتوار تھا۔ اور اسلم کا دل بھی خوش تھا۔ آج پھر اس کی زرینہ سے ملاقات ہونے والی تھی۔ وہ بار بار اپنی کلائی اٹھا کر وقت دیکھتا۔ "ابھی بہت سویرا ہے۔ ابھی تو وہ سو رہے ہوں گے۔"

وہ کئی بار اپنی خوابوں کی دلہن کے شبستان کی طرف آتا۔ مگر یہی فقرہ کہتے ہوئے واپس مڑ جاتا وہ کئی بار انار کلی اور ٹھنڈی سڑک پر آوارہ گردی کرتا رہا۔ مگر جب بھی اس نے اپنی رلیسٹ واچ میں وقت دیکھنے کی کوشش کی۔ اسی وقت کہا۔

"خدا معلوم آج وقت کیوں نہیں گزرتا۔"

زرینہ کا دل بھی آج مسرت وشادمانی کے جذبے سے سرشار تھا۔ اس نے صندوق کھول کر قسم قسم کے کپڑوں کے جوڑے نکال کر دیکھے آج اسے کوئی سوٹ ہی پسند نہیں آتا تھا۔ آخر بہت مشکل کے بعد اسے فروزی رنگ کی سرخ پھولدار قمیص شانٹیل پلین فروزی رنگ کی شلوار اور اسی رنگ کا دوپٹہ پہنا۔

زرینہ اسلم کی آمد سے قبل بہت اچھی طرح سے ٹھیک ٹھاک ہوگئی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے والدین سیٹھ امتیاز علی کی بیمار داری کے لیے ان کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ اسلم ہاتھ کا اشارہ پاتے ہی سیڑھیوں کی طرف آگیا۔

زرینہ نے اسے ڈرائینگ روم کے پچھلے کمرے میں بٹھا دیا۔ آج زرینہ میں پھر پرانی ادائیں نکھر آئی تھیں۔ اس کی آنکھیں بجلی کی طرح چمک رہی تھی وہ آج ناز، شوخی اور ہنسی کا ایک عجیب مجسمہ بنی اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"سنائیے کیا حال ہے۔ کیسے گذر رہی ہے آج کل!" اسلم نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اچھا حال ہے۔ اچھی بھلی جیسی بھی ہو گذر رہی ہے۔" زرینہ نے اسلم کے پاس بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا وہ گئے ہوئے ہیں؟"

"جی ہاں! وہ گئے ہیں تو آپ آئے ہیں۔"

"تو پھر اور کچھ سنائیے" اسلم کروٹ بدلتے ہوئے بولا۔

"کیا سناؤں! جس دن آپ ملاقات کر کے گئے تھے۔ اسی رات آپ مجھ کو

اور میں آپ کو خواب میں مل کر ایک دوسرے سے خوب لطف اندوز ہوئے"۔

"آخر وہ خواب کیا تھا؟"

"نہیں۔ . . . . اگر خواب کسی کو بتا دیا جائے تو تمام بنے بنائے کام بگڑ جاتے ہیں"۔ زرینہ نے خوفزدہ ہو کر کہا

اسلم نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ تمہاری شادی کا اونٹ کس کروٹ بیٹھ رہا ہے؟

"آج تو وہاں یہ باتیں ہوں گی یہ کہیں گے۔ میری زرینہ جیسی فرمانبردار لڑکی کسی اور گھرانے میں جنم بھی نہیں لے سکتی۔ وہ کہیں گے ہمارا لڑکا بھی شرافت میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اسی طرح دن کے جاگتے ہیں وہ کئی سنہری خواب دیکھیں گے۔ مگر زرینہ جس کی ہے اسی کے پاس جائے گی"۔

"زرینہ! آخر کار ان کی کامیابی یقینی ہے وہ اپنی خواب کی ضرور تعبیر دیکھیں گے۔ البتہ ہمارے سنہری سپنے ادھورے کے ادھورے ہی رہیں گے"۔

"کیسے ادھورے رہیں گے۔ آجکل تو یہ کوئی ایسی بات نہیں کرتے جس کا کوئی مؤثر جواب نہ دیا جا سکے۔ جب میں دیکھوں گی کہ اب آخری وقت آپہنچا ہے اس کے بعد کوئی پیش نہیں چلے گی تو پھر میں ہر جائز و ناجائز کارروائی سے تمہارے پاس پہنچ جاؤں گی"۔

زرینہ ! دو دلوں کے مل جانے کا نام محبت نہیں ہے بلکہ اصل محبت اُسے

کہتے ہیں۔ جس سے دو دھڑکتے ہوئے دل زور زور دھڑکتے رہیں۔ میں آج تمہیں یہ بتانے کے لیے آیا تھا۔ کہ دیکھو زرینہ! تم میری خاطر اتنی تکلیف نہ اٹھاؤ۔ میرے لیے یہ خوشی کیا کم ہے کہ کم ازکم میری زرینہ! بے وفا نہیں نکلی۔ میں سمجھتا ہوں۔ تم آج بھی میری ہو اور جب تم نصیر کی ہو جاؤ گی۔ اس وقت بھی میری رہو گی۔ اس وقت بھی میرے دل میں رہو گی۔ اس لیے تم مزید اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔"

"میں یہ خوب اچھی طرح سوچ سمجھ چکی ہوں کہ میں اپنے اس پاک بدن پر آپ کے سوا اور کسی کا ناپاک ہاتھ لگنے نہیں دوں گی۔ خواہ اس کے لیے مجھے بڑی سے بڑی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔

میری جان زلف کے پھندے بنانا کس سے سیکھا ہے
نگاہِ ناز سے بجلی گرانا کس سے سیکھا ہے
تمہیں یہ شوخی و غمزہ ادائیں کس نے بخشی ہیں
یہ اندازِ محبت سچ بتانا کس سے سیکھا ہے

زرینہ! ایسے سے تمہارے والدین کی بدنامی ہو گی۔ تمہارا گھرانا سارے خاندان میں رسوا ہو جائے گا۔

ہوا دل دیوانہ تیرے لیے۔
کسی نے چھوڑا زمانہ تیرے لیے۔

"میں اپنے والدین سے اپنا اولین حق مانگتی ہوں اگر وہ اس حق سے منحرف ہو کر ناجائز کارروائیوں پر اتر آئیں۔ تو پھر میں آپ اور صرف آپ کے لیے سب کو چھوڑ دوں گی۔ مجھے آپ کے سوا کسی کی عزت کی کوئی فکر نہیں"

"کیا زرینہ! یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟" اسلم نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"بالکل آخری فیصلہ ہے۔ اب اس کے بعد کسی اور فیصلے کی گنجائش نہیں۔ آپ وقتاً فوقتاً اسی کھڑکی کے راستے مجھے ضرور دیکھا کریں۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو میں کاغذ پر لکھ کر پھینک دیا کروں گی۔

"اچھا زرینہ مجھے رخصت کی اجازت ہے۔

"اسقدر جلدی" زرینہ نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"کہیں وہ نہ آجائیں تمہارے ابا جان" خدا حافظ!!!

اسلم نے جونہی دروازے کی طرف آنے کے لیے اپنا رخ تبدیل کرنے کی کوشش کی تو کیا دیکھا۔ شیخ انتظار حسین اور بیگم زینت راستہ روکے خوب تن کر کھڑے ہیں انہیں دیکھ کر دونوں دنگ رہ گئے۔ تھوڑی دیر تک یہ سب لوگ ایک دوسرے کو دیکھ کر خاموش رہے۔ آخر شیخ انتظار حسین کی بھاری کوے کی طرح کی گرجدار آواز نے اس مہر خاموشی کو توڑا۔

"اسلم! تم یہاں پھر آگئے؟"

"جی! میں آیا نہیں بلکہ لایا گیا ہوں"

"ہونہہ... جواب بنانا تو اسے خوب آتا ہے" بیگم زینت بولی۔

"سچ بتاؤ تمہیں یہاں آنے کی کس نے اجازت دی" شیخ انتظار نے کڑکتے ہوئے کہا

"میرے دل کی آواز نے" زرینہ برجستہ بولی۔

"تمہارے دل کی آواز نے۔ کیا بکتی ہے کمبخت"

"شیخ صاحب: زرینہ جھوٹ بولتی ہے۔ میں اپنے کپڑے اور کتابیں لینے کے لیے آیا ہوں۔"

"شاباش بیٹا اسلم! مجھے تم سے یہی امید تھی۔ میں جانتا تھا۔ تم ایک اچھے لڑکے ہو۔ بڑوں کے حکم کو ماننا تم اپنی ایک سعادت مندی سمجھتے ہو۔ پھر تم یہاں آنے کی کیسے جرأت کر سکتے تھے۔ یہ لو۔ یہ ایک ہزار روپیہ ہے تم نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر زرینہ کو بچا کر ہمارے خاندان کی لاج رکھتے ہوئے ہماری عزت محفوظ رکھی اور ہماری وہ بے بہا خدمت کی جو کوئی اور نہیں کر سکتا تھا ہم نے اس کے عوض تمہیں دو تین سال اپنے پاس بیٹا بنا کر رکھا۔ وہ اور یہ ایک ہزار روپیہ، تمہاری اس خدمت کا صلہ ہے" شیخ انتظار حسین نے بڑے خطیبانہ انداز میں کہا۔

"شیخ صاحب! میں نے زرینہ کو سکھوں کے نرغے سے زندہ بچا کر آپ کی خدمت نہیں کی۔... زرینہ کی خدمت نہیں کی... اور نہ آپ کے خاندان کی خدمت نہیں کی... بلکہ ایک مسلمان کی خدمت کی ہے۔ ایسا کرنا میرا فرض

اوّلین تھا۔ خدمت کا کوئی صلہ نہیں ہوتا اور پھر خدمت وہ ہوتی ہے جو کسی کو جتائی نہ جائے۔ یہ ایک ہزار روپیہ اپنے نئے داماد کو میری طرف سے سلامی دے دینا۔"

یہ کہتے ہوئے اسلم ایک ہزار روپے کے بنڈل شیخ انتظار حسین کے قدموں میں پھینک کر جلدی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

"او . . . . ہو . . . ہو . . . ہو . . . کہاں جا رہے ہو۔ بیٹا اسلم! کم از کم اپنے کپڑے تو لیتے جاؤ۔"

"پھر کبھی آ کر لے جاؤں گا۔ آپ تیار رکھیں"

"بڑا ہی عجیب لڑکا ہے۔ ابھی لے جاتا تو کیا ہی اچھا تھا۔ بیگم زینت نے اپنا برقعہ اتارتے ہوئے اسی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا جس کرسی پہ تھوڑی دیر ہوئی اسلم بیٹھا ہوا تھا۔

کون کہتا ہے کہ آنسو ہیں مصائب کا علاج
ناحق اس جان کو تم روگ لگاتی کیوں ہو

تم میں ہمت ہو تو اس دنیا سے بغاوت کرلو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کرلو

اکیسواں باب

شام کو کھانا کھانے کے بعد زرینہ بالائی منزل پر اپنے کمرے میں لیٹ گئی۔ شیخ انتظار حسین اور بیگم زینت نے اپنے اپنے بستروں پر دراز ہوتے ہوئے موضوعِ سخن زرینہ کی شادی کے سانچے میں ڈھالتے ہوئے بدل لیا۔ وہ دونوں ساری رات بھی اندازہ لگاتے رہے کہ زرینہ اور اسلم نے آج آپس میں کیا کیا باتیں کیں وہ یہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اسلم کو اس کے کپڑوں کی تلاش نہیں بلکہ زرینہ کی محبت یہاں کھینچ کر لائی ہے وہ یہ خوب اچھی طرح سے جانتے تھے کہ یہ دونوں عشق سے سرشار ایک دوسرے پر پروانہ وار نثار ہیں، گھنٹوں سوچ بچار کے

بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ انہیں زرینہ کی برات جلدی روانہ کردینی چاہیئے۔

دو دن کے بعد شیخ انتظار حسین سیٹھ امتیاز علی کے گھر ان کی بیمار داری کے بہانے سے پھر گئے۔ سیٹھ امتیاز علی پورے طور پر صحت یاب ہو چکے تھے۔ شیخ انتظار حسین نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ جلدی ہی نصیر کی برات لے آئیں سیٹھ امتیاز علی اس شور سے بہت متعجب ہوئے کیونکہ آج سے دو دن پہلے انہوں نے شیخ انتظار حسین اور بیگم زینت کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کہا تھا

"میں نہیں جانتا میری زندگی کتنی باقی ہے۔ میری یہ دیرینہ خواہش ہے کہ جلد از جلد اپنے بیٹے کے ماتھے پر سہرے کی لڑیاں لٹکتی ہوئی دیکھ لوں۔ اس لیے آپ برات کا انتظام کرنا شروع کردیں۔"

اسی وقت ان دونوں سے برجستہ یہ کہا تھا:۔

"ایسا نہ کہیئے سیٹھ صاحب! آپ بہت جلد اچھے ہو جائیں گے ابھی تو ہمارے جہیز کی تیاری میں کچھ عرصہ لگے گا۔"

دو دن بعد آج سیٹھ امتیاز علی اسی شیخ انتظار حسین سے یہ سن رہا تھا کہ برات کے لیے جلدی تیاری کیجئے۔ ہم بالکل تیار ہیں اس وقت سیٹھ امتیاز علی سوائے بہانہ تراشنے کے اور کوئی تیاری نہ کر سکے مگر اسی شام انہوں نے اپنی بیگم سے مشورہ کرتے ہوئے پوچھا:۔

"اس میں وہ کیا راز ہو سکتا ہے جس سے شیخ انتظار حسین شدید متاثر ہوئے ہیں

"میں کچھ سمجھی نہیں" بیگم امتیاز علی نے سیٹھ امتیاز علی کے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں ابھی سمجھائے دیتا ہوں۔ ذرا پیچھے ہٹ کر تکیئے کے ساتھ ٹیک لگا کر اچھی طرح بیٹھ جاؤ۔"

"اچھا تو سنو! آج سے دو دن پہلے میں نے انہیں کہا کہ تم تیاری کرو۔ ہم آ رہے ہیں مگر انہوں نے بہانہ لگاتے ہوئے جواب دیا کہ ابھی تو ہمارے جہیز کی تیاری میں دیر لگے گی مگر وہ آج مجھے کہتے ہیں۔ کہ جہیز تیار ہے تم دولہن لیجانے کی تیاری کرو"

"یہ کوئی ایسی فکر کی بات نہیں جس پر سوچ بچار کیا جا سکے آپ ہی کے کہنے پر انہوں نے سوچ کر فیصلہ کیا۔ کہ آخر یہ کام تو کرنا ہی ہے کل گیا اور آج کیا۔ میں آج ہی نصیر سے پوچھ کر صحیح مناسب تاریخ متعین کر کے انہیں بتا دوں گی۔"

جب نصیر شام کا کھانا کھا کر فارغ ہوا تو بیگم امتیاز علی نے جھومتے ہوئے خوب لاڈ پیار سے نصیر کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:۔

"بیٹا ہم یہ چاہتے ہیں کہ وہ وقت بھی دیکھ لیں۔ جب تمہارے سر پر سہرے کی لڑیاں آویزاں ہوں۔ اور تم خوشی خوشی اپنے لیے چاند سی صورت والی دلہن اور میرے لیے ایک اچھی بہو بیاہ کر لاؤ"

"امّاں جان! اگر آپ مجھ پر آج اتنی مہربان ہیں۔ تو مجھے وہ حق کیوں نہیں دے دیتیں۔ جو میں مانگتا ہوں۔" نصیر نے اپنے شوز اتارتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر وہی پرانی باتیں۔ کیا تمہیں ہم پر بالکل اعتماد نہیں رہا۔" بیگم زینت جھنجھلا اٹھی۔

"دراصل۔ مجھے نہ تو یہ رشتہ پسند ہے۔ اور نہ ہی اس رشتے کے رشتے دار۔"

"اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہم تمہارا نکاح کر چکے ہیں"۔

"اگر آپ میرے راستے سے ہٹ جائیں۔ تو میں سب کچھ کر سکتا ہوں"۔

"ہتھیں طلاق لکھوا لینا کوئی شریفوں کا شیوہ نہیں۔ طلاق ہمیشہ خاندان میں بدنامی کا باعث بنتی ہے"۔

"اگر میری دولہن خود طلاق لینے پر اصرار کرے۔ پھر تو برا نہیں۔ میں اسے مل کر سمجھاؤں گا"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے!" بیگم امتیاز علی نے اچانک گرجتے ہوئے کہا۔

"میں سب کچھ کر سکتا ہوں" نصیر نے برجستہ جواب دیا۔

"نصیر! تم شادی شدہ ہو۔ تمہارا نکاح ہو چکا ہے۔ ایسی باتیں کرنا تمہیں زیب نہیں دیتا۔ ہم عنقریب تمہاری برات کا انتظام کرنے والے ہیں۔ سن لیا تم نے"۔

"مگر مجھے یہ منظور نہیں۔ اگر آپ نے میری شادی کردی تو میں دیوانہ ہو جاؤں گا۔"

"اگر اس طرح لوگ دیوانے ہونے لگیں تو پھر آگئی قیامت،" یہ کہتے ہوئے نصیر کی والدہ نے سیٹھ امتیاز علی کے کمرے کی طرف اپنا رخ پھیر لیا۔

بائیسواں باب

دوسرے دن نصیر نے اپنے جگری دوستوں رحیم، کریم اور سلیم کو بلا کر تمام واقعات سنائے۔ اور مشورہ کیا کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیئے اس وقت کوئی قدم اٹھانا ضروری تھا۔ تاکہ شاہینہ کو حاصل کیا جائے۔ سب دوستوں نے اسے مشورہ دیا کہ تم فوری طور پہ اپنے آپ کو پاگل ظاہر کردو ہم سب تم کو پکڑ کر گھر چھوڑ آتے ہیں۔ گھر میں تم سب سے اوٹ پٹانگ باتیں کرنا۔ میزیں، کرسیاں اور شیشے کے برتن توڑتے ہوئے مصنوعی طور پہ یہ ظاہر کرانے کی کوشش کرنا تاکہ تم واقعی سچ مچ پاگل ہو گئے ہو یہ خبر بجلی کی سی تیزی کے

ساتھ زرینہ کے گھر پہنچ جائے گی ممکن ہے کسی خدشہ کے ماتحت زرینہ کی برات کی سب تیاریاں فوری طور پر بند کر دی جائیں گیں۔ جب زرینہ کے والدین تمہیں دیکھنے کے لیے گھر آئیں تو تم مصنوعی پاگل بن کر وہ غضب کی باکمال اداکاری کرنا کہ بڑے سے بڑا آرٹسٹ بھی تمہیں دیکھ کر واہ واہ کر اٹھے۔ بس یہ معمولی کام کرنے کے بعد تمہاری مشکل آسان ہو جائے گی۔ تمہارے سسرال خود ہی کوشش کریں گے کہ طلاق دے دو۔ ہم کسی پاگل سے اپنی بیٹی کی شادی نہیں کر سکتے اور سیٹھ صاحب بھی یہ اچھی طرح جان جائیں گے کہ ان کی غلطی کے صدقے سے ان کا بیٹا جنوں کے دورے سے دوچار ہو گیا ہے۔

نصیر نے ان کی نصیحت کو پلے باندھ لیا۔ دو گھنٹے بعد سب کاریں ان کے بنگلے پر اتریں۔ ان کے بنگلے کے بڑے برآمدے کے ساتھ ایک پارک تھا جس میں ایک چھوٹا سا تالاب تھا اور تالاب میں ایک چھوٹا سا فوارہ تھا۔ سیٹھ امتیاز علی تالاب کے کنارے کرسی پر بیٹھے خوب پاؤں پھیلائے نہایت سنجیدگی سے اخبارات کے مطالعہ میں مشغول تھے۔ نصیر کو تین مردوں کی قید میں بری طرح جکڑا ہوا دیکھ کر سیٹھ امتیاز علی کے پاؤں سے زمین نکل گئی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ ہاتھ سے اخبار چھوٹ گیا۔ اس نے لرزتے اور کانپتے ہوئے پوچھا۔

"ک۔۔۔۔ک۔۔۔۔ کیا ہو گیا ہے۔۔ م۔۔۔۔م۔۔۔م۔۔۔۔جسم۔۔۔۔

میرے بچے کو ؟"

"آج صبح انہیں جنون کا دورہ پڑ گیا ہے جس کا حملہ بڑا شدید ہے۔" سلیم بولا۔

"جنون کا دورہ! ہائے میں مر گئی۔" ایک کمرے سے بیگم امتیاز علی ہانپتے ہوئی نکلی اور نصیر سے لپٹ گئی۔

وہ سب نصیر کو ڈرائنگ روم میں لے آئے اور لاکے ایک صوفے پر بٹھا دیا۔ نصیر صوفے پر بیٹھتے ہی گرجنے لگا۔

"تم سب میری نظروں سے دور ہو جاؤ تم سب میرے دشمن ہو۔"

"کیا ہو گیا میرے لال تمہیں!"

"چلو اٹھو۔ یہاں کوئی لال پیلا۔ گلابی نہیں۔ یہاں نصیر ہے۔ صرف نصیر۔"

"لا بیٹا! تم کس بد نظر کا شکار ہوئے ہو آج صبح صبح تم نے کس کا منہ دیکھا تھا۔"

"تم اس طرح سے نہیں جاؤ گے۔ میں کہتا ہوں تم سب میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔ میں اس گھر کو آگ لگا دوں گا۔ تم سب کو جلا کر راکھ کر دوں گا۔"

یہ کہتے ہوئے نصیر نے شیشے کے کئی برتن توڑ ڈالے۔ سب ڈر کر باہر بھاگے۔ سیٹھ امتیاز علی نے سلیم کو بھجا تا کہ کوئی اچھا سا ڈاکٹر لائے۔

کریم بولا۔ "نہ۔۔۔۔نہ۔۔۔۔نہ ڈاکٹر کو نہ بلائیے! ڈاکٹروں کی دوائیں گرم

ہوتیں ہیں جس سے اچھا بھلا تندرست آدمی پاگل ہو جایا کرتا ہے آپ کسی اچھے حکیم سے مشورہ کریں۔"

"پاکستان میں حکیم ہی کون ہے جس سے مشورہ لیا جائے سب یونہی پُڑے باندھ کر رکھ دیتے ہیں۔" بیگم زینت نے اندر جھانک کر کہا

"ایسا نہ کہیئے چچی جان! پاکستان میں کئی حکیم الملک، شفاء الملک، دماغ الملک، امراض الملک موجود ہیں میرے ایک بھائی کو پچھلے سال ایسا ہی کچھ ہو گیا تھا۔ ہم نے بھی اسے ایک حکیم کو دکھایا تھا ایک ہفتے بعد وہ ٹھیک ہو گیا اور آج تک ٹھیک ہے۔" رحیم نے اپنے کپڑے ٹھیک کرتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا تو پھر تم نے جس حکیم سے اپنے بھائی کا علاج کروایا تھا۔ اسی کو جا کر بلا لاؤ۔"

سیٹھ امتیاز علی نے جیب سے ایک سو روپے کا نوٹ نکال کر رحیم کو دیتے ہوئے کہا۔ نصیر اب فرنیچر کو توڑنے میں مشغول تھا۔ رحیم، حکیم کو لینے چلا گیا۔ باقی سب نے نصیر کو رسیوں سے باندھ کر لٹا دیا۔ نصیر نے اپنی یہ حالت دیکھی تو اس کا جنون بھی کم ہو گیا۔ رحیم انار کلی سے ہمدرد دواخانہ کے تیار کردہ طاقت کے کشتہ جات خرید کر لے گیا۔

"یہ کشتہ جات حکیم الملک، شفا الملک حکیم و ڈاکٹر محمد سعید مالک ہمدرد دواخانہ دہلی کے بنے ہوئے ہیں میں نے ان کے حکیم کو تمام حالات سے آگاہ کر دیا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ ان کے دماغ پر کسی صدمے کا بوجھ پڑا ہے۔ ان کشتہ جات سے ٹھیک ہو جائیں گے آپ ان کے دل و دماغ سے وہ صدمہ دور کرنے کی کوشش کریں"۔

دو دن تک علاج ہوتا رہا۔ نصیر مختلف اوقات پاگل بننے کی مصنوعی اداکاری کر کے گھر والوں کے دلوں کو متاثر کرتا رہا۔ مگر نصیر کے سسرال میں سے کوئی بھی خبر گیری کے لیے نہ آیا۔ آتا بھی کیسے جب کہ سیٹھ امتیاز علی نے اپنی تمام تر کوششوں سے نصیر کی اس حالت کا علم کسی کو نہ ہونے دیا۔ نصیر اس سے بہت متفکر ہوا تھا اس نے موقع پا کر سلیم کے کان میں کچھ کہا۔ دوسرے دن سلیم شیخ انتظار حسین کے دفتر گیا جہاں وہ شیخ انتظار حسین سے ایک فرضی کام کے بارے میں کچھ واقفیت حاصل کرتا رہا۔ جب شیخ انتظار حسین نے اس کام کے بارے میں جو کچھ بتانا تھا بتا دیا۔ تو سلیم نے ان سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا میں نے آپ کو شیخ نصیر صاحب کے نکاح کے وقت کہیں دیکھا تھا۔

"جی ہاں! نصیر صاحب میرے داماد ہیں"۔ شیخ انتظار حسین سلیم کا ہاتھ دباتے ہوئے بولے۔

"او۔۔۔۔ ہو۔۔۔۔۔۔ ہو۔۔۔۔ پھر تو آپ کی بڑی بیڈ لک ہے"۔

"وہ کیوں۔۔۔۔ وہ کیوں" شیخ انتظار حسین نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"آپ کو نہیں معلوم! نصیر صاحب کا دماغ فیل ہو گیا ہے۔ وہ تو بیچارے پاگل ہو گئے ہیں"۔ سلیم نے اپنے دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈالتے

ہوئے جواب دیا۔

"اچھا! ہمیں تو کوئی اطلاع ہی نہیں ملی۔ شیخ انتظار حسین بولے۔

"آپ آج ضرور ان کے گھر جا کر انہیں دیکھیں۔ کیونکہ وہ آخر آپ کے داماد ہیں"۔

یہ کہہ کر سلیم شیخ انتظار حسین سے سلام کر کے چلا آیا۔

شیخ انتظار حسین یہ سن کر بے حد رنجیدہ ہوئے وہ بارہ بجے کے بعد نصف دن کی چھٹی لے کر گھر پہنچے۔ بیگم زینت کو حالات سے آگاہ کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں میاں بیوی سیٹھ امتیاز علی کے بنگلے پر پہنچ گئے۔ نصیر اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹا اخبار پڑھ رہا تھا انہیں آتا دیکھ کر اس کے سر پر جنون سوار ہوتا گیا جب وہ اس کے کمرے کے دروازے پر آکر رک گئے تو ادھر سے تقریر شروع ہوئی۔

"یہ دروازے میں کس کی تصویر لٹکی ہے۔ اسے پھاڑ دو"۔

"کیا ہوا بیٹا نصیر تمہیں!" وہ دونوں بولے۔

"میں پاگل ہوں .... پاگل ..... تم تو عقلمند ہو۔ چلے جاؤ اس کمرے سے۔ اس کمرے میں عورت کا کوئی کام نہیں۔ ہم عورت سے نفرت کرتے ہیں"۔

وہ دونوں اس کے بیڈ کے قریب رکھی ہوئی کرسیوں پر آکر بیٹھ گئے۔

"کوئی فکر نہ کرو۔ بیٹا نصیر! تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے۔ انسان کے دماغ

میں یونہی خلل آ ہی جایا کرتا ہے۔" شیخ انتظار حسین نے کہا۔

"تم پاگل ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمہارا باپ پاگل ہے۔ تمہاری بیوی پاگل ہے۔ تمہاری بیٹی پاگل ہے۔ میں پاگل نہیں ہوں۔ میں شرابی نہیں۔ میں کوئی بدمعاش نہیں ہوں پھر یہ لوگ کیوں مجھے رسیوں سے باندھ دیتے ہیں اگر یہ لوگ مجھے چور سمجھتے ہیں تو پھر میری شادی ہی کیوں کرتے ہیں میں آج ان لوگوں کی قید سے آزاد ہو جاؤں گا۔ میں تم سب کو مار ڈالوں گا۔ تم سب کو زندہ جلا کر راکھ کر دوں گا۔ اس زمین کو جلا دوں گا۔ آسمان کو توڑ دوں گا۔ اور اس فرنیچر کو کھا جاؤں گا۔ کھا جاؤں گا۔ بالکل کچا چبا جاؤں گا۔" نصیر نے اپنی پوری قوت کے ساتھ چیخ چیخ کر کہا۔ ادھر سے دیگر اہل خانہ بھی آ گئے۔ نصیر نے پھر فرنیچر کو توڑنا شروع کر دیا۔ پھر ان سب نے مل کر نصیر کو رسیوں کے ساتھ باندھ دیا اور خود دوسرے کمرے میں چلے گئے تھوڑی دیر تک نصیر باواز بلند باتیں کر کے ان کے سر کو کھاتا رہا۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد رحیم، کریم اور سلیم بھی آ گئے۔

"سناؤ بھئی! آج کا پروگرام کیسا ہے؟ نصیر نے انہیں اپنے پاس بٹھاتے ہوئے پوچھا

"آج کا پروگرام بہت اچھا ہے۔ شاہینہ آئی ہوئی ہے۔" سلیم بولا۔

"تو پھر کیا سوچتے ہو۔ چلو چلیں۔ تھوڑی دیر وہاں گھومیں گے۔

جب وہ کار میں بیٹھ رہے تھے تو سیٹھ امتیاز علی نے پوچھا۔

"کہاں لے جا رہے ہو نصیر کو"

"یس جی انہیں ذرا باغوں کی سیر کرائیں گے اس وقت تو ان کی طبیعت ٹھیک ہے نا۔"

وہ سب یک زبان ہو کر بولے۔

وہ کار لے کر بنگلے سے باہر نکلے تو سیٹھ امتیاز علی نے اپنی کار کو سٹارٹ کر کے ان کے پیچھے لگا دیا کوئی ڈھائی تین گھنٹے کے بعد سیٹھ امتیاز علی پسینے سے شرابور واپس لوٹے اور اپنی بیگم سے قدرے گھبرائے ہوئے پوچھا۔

"کیا وہ چلے گئے؟"

"جی ہاں! وہ دونوں چلے گئے۔"

"دیکھ لی تم نے اپنے بیٹے کی کرتوت!" سیٹھ امتیاز علی نے گرجتے ہوئے کہا۔

"کیوں کیا ہوا؟"

"جاؤ! وہ سٹینڈرڈ ہوٹل میں ناچ رہا ہے۔" سیٹھ امتیاز علی نے ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہائے میں مر گئی۔ قدرت نے میرے بیٹے کو کیا کر دیا۔ اب اسے اتنی بھی ہوش نہ رہی کہ ہوٹلوں میں ناچنے لگ گیا۔"

"قدرت نے اسے کچھ نہیں کیا۔ وہ ہم سے زیادہ ہوش میں ہے۔"

"نہیں وہ بیچارہ پاگل ہو گیا ہے۔"

"وہ بالکل پاگل نہیں بلکہ اس نے ہم کو پاگل بنانے کی کوشش کی۔ میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ سٹینڈرڈ ہوٹل کی مشہور ڈانسر شاہینہ کو اپنی کار میں بٹھا کر کہیں لے گیا ہے۔" سیٹھ امتیاز علی نے رومال سے اپنا پسینہ خشک کرتے ہوئے کہا۔

"مگر اس نے پاگل بن کر اس قدر پریشان کرنے کی کوشش کیوں کی" بیگم امتیاز علی نے بے ساختہ کہا۔

"اس کا جواب وہ آکر دے گا۔ بیگم تم کل پرسوں ان کے گھر جانا۔ انہیں یہ خوشخبری سناتے ہوئے کہنا کہ نصیر بالکل ٹھیک ہو گیا ہے مگر ہم چاہتے ہیں کہ اس کی شادی چار ماہ کے بعد کریں گے۔ تاکہ اس کے دماغ پر کسی قسم کا بوجھ نہ پڑ سکے۔"

تقریباً دس بجے رات کے نصیر گھر آیا۔ سیٹھ امتیاز علی اس کے انتظار میں بیٹھے تھے۔

"اتنی رات گئے تم کہاں سے آئے ہو بیٹا؟" بیگم زینت نے بڑے لاڈ پیار سے پوچھا۔

"تم کون ہوتے ہو جی بیچ میں بولنے والے"۔ نصیر نے کڑکتے ہوئے جواب دیا

"ٹھیک ہے بیٹا۔ . . . ٹھیک ہے بڑوں کا ادب تم میں کوٹ کوٹ کر بھرا

ہوا ہے"۔

سیٹھ امتیاز علی نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"تم یہ نہیں سمجھتے کہ میں پاگل ہوں۔ پھر تم بار بار مجھ کو کیوں بلاتے ہو"۔ نصیر اکڑتے ہوئے بولا۔

"میں یہی بتانے کے لیے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ کہ اب تم پاگل نہیں رہے"۔

"کیا مطلب آپ نے زرینہ کو طلاق دے دی"۔ نصیر کا چہرہ مسرت سے تمتما اٹھا۔

"ہوں زرینہ کو طلاق دے دی اور شاہینہ سے تمہارا نکاح پڑھا دیا"۔

"کیا مطلب! میں کچھ سمجھا نہیں۔ کونسی شاہینہ!"

"وہی جسے تم اپنی کار پہ بٹھا کر اس کے گھر چھوڑنے گئے تھے"۔

"کیا یہ آپ کہہ رہے ہیں"۔ نصیر حیران ہو کر بولا۔

"ہاں یہ تمہارا بدنصیب باپ کہہ رہا ہے تم نے اس باپ کو دھوکہ دینے کی کوشش کی جس کی بدولت تم اس رنگ و بو کی دنیا کو دیکھنے کے قابل ہو سکے۔ جہاں ہزاروں شاہینہ جنم لیتیں اور لوگوں کو قتل کرتی ہیں۔ تم نے اس باپ کو دھوکہ دینے کی کوشش کی جس نے تمہارے حلق میں سب سے پہلے شہد کا قطرہ ڈالا تھا۔ تم نے اس ماں کو دھوکہ دینے کی کوشش کی جس نے تمہاری پرورش کی خاطر ہزاروں تکالیف کا سامنا کیا۔ تم نے اس باپ کو دھوکہ دینے کی کوشش کی جس کے ہاتھوں میں تم نے آنکھ کھول کر سب سے پہلے اس دنیا کو دیکھا۔ تم نے اس

باپ کو دھوکہ دینے کی کوشش کی جس کے بنائے ہوئے راستوں پر تم نے چلنے کی کوشش کی مگر افسوس بھٹک گئے۔ اب بھی راہِ راست پر آجاؤ نصیر اب بھی وقت ہے۔"

"میں کیا کروں۔ میں نے اپنے مفاد کی خاطر یہ حربہ استعمال کیا تھا۔"

"تم آخر کیا چاہتے ہو نصیر؟!" سیٹھ امتیاز علی نے پوچھا۔

"میں اپنی پسندیدہ شاہینہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"نصیر! کیا تم یہ جانتے ہو۔ کہ تمہاری پسندیدہ شاہینہ ایک طوائف ہے۔"

"مگر اس کا طوائف ہونا اس کا قصور نہیں۔ اسے زمانے کی ٹھوکروں اور ماحول نے طوائف بننے پر مجبور کر دیا۔" نصیر نے اپنا کوٹ اتارتے ہوئے کہا

"میں تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ تمہیں اپنی روش سے باز آنا پڑے گا۔"

"میں کیا کروں۔ میرا دل اس پر فریفتہ ہو چکا ہے میں اسے طوائف کے ذلت بھرے گھڑے سے نکال کر اپنے شبستان میں ایک شریف گھرانے کی بہو بنا کر دکھوں گا۔

"وہ یہاں نہیں آئے گی۔ تمہیں ہماری پسندیدہ سے شادی کرنی پڑے گی۔" سیٹھ امتیاز علی نے غصّے سے لال پیلا ہوتے ہوئے کہا۔

"اگر یہاں کوئی آئی تو پھر وہی آئے گی۔" نصیر نے اپنے شوز اتارتے ہوئے جواب دیا۔

میری طرف دیکھو نصیر! میرے چہرے کی طرف دیکھو۔ میری صحت کی طرف دیکھو۔ میں بہت بوڑھا ہو چکا ہوں۔ یہ میرا آخری وقت ہے اب نہ مجھے تم جیسا کوئی بیٹا مل سکتا ہے اور نہ تمہیں مجھ جیسا کوئی باپ! بہتر یہی ہے۔ کہ ہم آپس میں کوئی معقول سمجھوتہ کر لیں۔ ہم تمہارا نکاح کر چکے ہیں اس لیے کوئی بھی ایسا قدم نہ اٹھانا جس سے تمہارے رشتے کو کوئی ضعف پہنچے۔ ہمارے لیے باعثِ شرم اور بے عزتی ہے ورنہ وجہ تمہیں زرینہ سے شادی کرنا ہی پڑے گی۔ میں تمہیں چار ماہ کی مہلت دیتا ہوں۔ خوب اچھی طرح سے سوچ سمجھ لو۔ ورنہ پھر میں اپنی قسمت کو روتا پھروں گا۔ جاؤ اور آرام کرو۔"

سیٹھ امتیاز علی اپنے کمرے میں آکر لیٹ گئے۔ اور نصیر کھانا کھا کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

(۲۳) تیئسواں باب

ضیغم کے مصنوعی پاگل ہونے سے پہلے جب دونوں اطراف سے برات کی زبردست تیاریاں ہو رہی تھیں تو زرینہ نے اسلم سے ملاقات کرنے کی، بارہا کوشش کی۔ مگر بیگم زینت اور شیخ انتظار حسین کی کڑی نگرانی سے ہر بار دو دھڑکتے ہوئے دلوں کی کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ جب صبح کی روشنی میں وہ آپس میں ملنے میں ناکام رہے تو انہوں نے رات کی تاریکی میں ملاقات کا پروگرام بنایا۔ جب شیخ انتظار حسین سونے کے لیے بستر پر لیٹ جاتے تو زرینہ کسی نہ کسی بہانے نیچے آ کر بڑا دروازہ کھول جاتی۔ اسلم آ کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ جاتا زرینہ

اوپر جا کر لیٹ جاتی۔ جب وہ یقین کر لیتی کہ اس کے نگہبان اب گہری نیند کی عمیق گہرائیوں میں ڈوب چکے ہیں۔ تو وہ چپکے سے نیچے آجاتی اور ملاقات کے دروازے کو دستک دیتے ہوئے کہتی۔

"سنائیے کیا حال ہے؟"

"بس اپنی سنائیے۔"

"ہماری کیا سنتے ہیں آپ! چار ماہ کے بعد آنے والی اتوار کی تاریخ متعین ہو چکی ہے۔ ایک ماہ بیت چکا ہے گن گن کر وقت نکال رہی ہوں۔ خیال ہے ان باقی ماندہ تین مہینوں میں ایک وقت ایسا آئے گا جب مقصد پورا ہو گا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر ہمیں فرار ہونے کے لیے سفر اختیار کرنا پڑے گا۔"

"کیوں؟"

"یہ بھی وقت آنے پر بتاؤں گی۔"

"کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے زرینہ۔"

"کیوں نہیں اعتبار بھی ہے اور اعتماد بھی! مگر وقت کی آواز وقت پر سنائی دے تو اچھی لگتی ہے۔"

اسی طرح وہ ہر رات ایک ہی موضوع پر باتیں کرتے اس سے وہ ہر روز کے حالات پر سیر حاصل تبصرہ کر لیتے۔ خدا معلوم کیوں ان دونوں کو یہ پختہ یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور ایک ہو جائیں گے اسی طرح ایک رات

ان کی ملاقات اختتام پر تھی اسلم نے آنے کی اجازت چاہی مگر زرینہ کا دل اب بھی یہی کہتا تھا کہ وہ اسلم کے قریب زیادہ سے زیادہ دیر تک بیٹھے اس کی آنکھیں ابھی تک یہی چاہتی تھیں۔ کہ وہ اسلم کو زیادہ سے زیادہ دیر تک دیکھ سکیں وقت بڑی سرعت کے ساتھ گزر رہا تھا اسلم کا دل نہ معلوم آنے والے خطرے سے دھڑک رہا تھا۔ جب بھی اسلم آنکھیں اٹھا کر کمرے کا جائزہ لینے کی کوشش کرتا تو اسے ہر سو خوف وہراس کی لہروں سے دوچار ہونا پڑتا اس نے کئی بار اٹھنے کی کوشش کی مگر جب وہ زرینہ کے اداس چہرے کو نظر بھر کر دیکھتا تو پھر بیٹھنے پر مجبور ہو جاتا آخر جب وہ مجبور ہو گیا تو اس نے اٹھتے ہی کہا "بس زرینہ نیند آ رہی ہے۔ وقت گزر رہا ہے اب مجھے چلنا چاہیئے"۔ زرینہ نے خدا حافظ کہنے کی بجائے سنجیدہ صورت بناتے ہوئے کہا

ے نہ تم آ سکو گے نہ کچھ بات ہو گی
بہت دکھ بھری چاندنی رات ہو گی
گھڑی دو گھڑی مل کے ہم مسکرا لیں!
خدا جانے پھر کب ملاقات ہو گی

"زرینہ آج تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ جاؤ اوپر جا کر آرام کرو۔ خدا حافظ"۔ اسلم زرینہ کے ساتھ کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گیا۔ بیشتر اس کے کہ زرینہ بھی اسے خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوتی۔ ان دونوں کے کانوں میں

بیک وقت ایک اور گرجتی ہوئی آواز ٹکرائی۔ جو شیخ انتظار حسین کی تھی۔

" چلی آؤ بیٹی زرینہ! چلی آؤ" شیخ انتظار حسین نے سیڑھیوں میں کھڑے ہو کر کہا۔

" کیا ابا جان! آپ نے مجھے آواز دی ہے"۔ زرینہ نے سیڑھیوں کے پاس جاتے ہوئے کہا۔

" زرینہ! تم نے جو قدم اٹھایا ہے۔ وہ ایک شریف خاندان کی شریف زادی کے شایانِ شان نہیں۔ بہتر یہی ہے تم جس تیزی کے ساتھ آگے بڑھی ہو اس سے دگنی تیزی کے ساتھ پیچھے ہٹ جاؤ"!

" ابا جان میں نے اس اسلم کے قدم کے ساتھ قدم ملانے کی کوشش کی ہے جس نے مجھے سکھ بربریت کے چنگل سے آزاد کر کے ایک نئی زندگی سونپی ہے اور آپ کے سر پر عزت کی دستار کو باندھا"

"بیٹی تم ٹھیک کہتی ہو۔ مگر اب تم اسلم کے ہاتھوں رکھی ہوئی دستار کو کیوں ریزہ ریزہ کرنے پہ تلی ہوئی ہو"۔

" محض اس لیے کہ آپ نے اس دستار کی قیمت نہ ادا کی"۔

" بیٹی! میں مجبور ہوں۔ ورنہ میں تیری شادی اسلم سے ہی کر دیتا۔ آج میں یہ کہوں گا کیا ہی اچھا ہوتا۔ اگر تو میرے گھر میں جنم نہ لیتی۔ تاکہ کم از کم مجھے بے آرام تو نہ ہونا پڑتا"۔

" ابا جان! آپ بالکل سچ کہتے ہیں۔ کتنا ہی اچھا ہوتا اگر میں کہیں اور پیدا ہوتی۔ تاکہ کم ازکم آپ اس وقت گہری نیند کے مزے لوٹ رہے ہوتے اور میں اپنی نیند کا ایک حصّہ ختم کر چکی ہوتی"

" تم بہت بڑھتی جا رہی ہو زرینہ! آج سے میں تجھ سے کوئی کلام نہیں کروں گا۔ آج سے تم اوپر سویا کرو۔ اور میں نیچے سویا کروں گا"

---

(۲۴)
چوبیسواں باب

دوسرے دن صبح کو دفتر جاتے ہوئے اسلم ادھر سے گزرا۔ تھوڑی دیر تک زرینہ کا انتظار کیا۔ کچھ دیر بعد وہ آئی۔ کاغذ کے ایک ٹکڑے پر جلدی سے رات کے گزرتے ہوئے واقعات کا حال لکھا اور کھڑکی سے پھینک دیا۔ اسلم اسے پکڑ کر چلتا بنا زرینہ اسے اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ ایک مہینہ گذر گیا اس دوران انہوں نے ملاقات کرنے کی لاتعداد کوششیں کی۔ مگر ہر بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ گھر میں عنقریب شادی رچانے کی چہ میگوئیاں

ہونی شروع ہوئیں۔ زرینہ تلملا اٹھی۔

"اگر اب میری اسلم سے ملاقات نہ ہو سکی تو پھر میں اسے کبھی نہ دیکھ سکوں گی۔" وہ بار بار موقعہ پا کر کھڑکی کی طرف آتی۔ گھنٹوں اسلم کا انتظار کرتی۔ مگر وہ اسے کہیں بھی اور کبھی دکھائی نہ دیا۔ وہ ساری رات کروٹیں بدل بدل کر اسلم کو ملنے کی تدبیریں سوچتی رہی۔ مگر وہ کوئی بھی ایسی ترکیب نہ سوچ سکی۔ جو اس کے لیے تبیر بن سکتی۔ صبح کی آذان ہو چکی تھی۔ پرندے خدائے تبارک و تعالیٰ کی حمدو ثناء میں زور شور سے مشغول تھے۔ خدا کی ایک مخلوق گہری نیند کے مزے لے کر بیدار ہو رہی تھی۔ بازار میں تانگوں اور گاڑیوں کے چلنے، پھرنے کی آوازیں آنی شروع ہو گئی تھیں مگر زرینہ کی شبنمی آنکھوں میں نیند کا غلبہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے ساری رات آنکھ جھبک کر نہ دیکھی تھی۔ مگر اب اس کی آنکھیں ایک عرصے تک بند رہنا چاہتی تھیں۔ اس کے قلب کا سکون جاتا رہا تھا۔ ہر لمحہ اس کے دل کی دھڑکن بڑھتی جا رہی تھی۔ اخبار کے ہاکر اپنی زوردار خصوصی آوازوں سے اخبار بیچ رہے تھے ان لوگوں کو بھی بستر نیند سے اٹھا رہے تھے۔ جو ابھی اٹھنے کے لیے آنکھیں مل رہے تھے۔

جونہی زرینہ نے ایک اور کروٹ لی۔ دفعتاً اس کے ذہن کے دھندے میں ایک خیال آیا۔ جو رفتہ رفتہ ایک سکیم کی شکل اختیار کرتا گیا۔ زرینہ مطمئن سی ہو گئی۔ اس نے بارہا بستر چھوڑنے کی کوشش کی مگر ہر بار اس کی

آنکھوں سے نیند کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے اسے مزید بستر پر دراز رہنے پر مجبور کر دیا۔

"اٹھو زرینہ! اب تو کافی دن چڑھ چکا ہے۔ ایک عالم جاگ چکا ہے۔ تعجب ہے تم ابھی تک خوابِ غفلت میں مدہوش پڑی ہو"۔ شیخ انتظار حسین نے حوائجِ ضروری سے فارغ ہونے کے لیے اوپر جاتے ہوئے کہا۔

زرینہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ شیخ انتظار حسین لڑین میں جا پہنچے اور زرینہ ڈرائنگ روم میں ان کے بیگ کی تلاشی لینے میں مصروف ہو گئی بیگ کئی ضروری کاغذات سے بھرا پڑا تھا وہ ایک ایک کاغذ کو دیکھ کر جلدی سے اس بیگ میں دوبارہ رکھتی گئی اس کا خیال تھا کہ بیگ میں ایک آدھ صاف لفافہ ہو گا۔ جس سے وہ اسلم کو خط کے ذریعہ پیام بھیج سکے گی مگر اس بیگ میں پڑے ہوئے سینکڑوں لفافوں میں کوئی ایسا لفافہ نہ تھا جو زرینہ کے کام آ سکتا۔

ان لفافوں کی پڑتال کرتے کرتے زرینہ کے ہاتھوں ایک سرکاری لفافہ آ گیا جس پر ڈاکخانہ کی سرکاری ٹکٹیں تو لگی ہوئی تھیں۔ مگر ڈاک خانے کی مہریں پیوست نہیں ہوئی تھیں۔ زرینہ نے اس لفافے کو دوہرا کر کے اپنی شلوار کے نیفے میں چھپا لیا۔ بیگ کو بڑی خوبی سے بند کر کے بڑی صفائی سے میز پر سجا کر رکھ دیا۔

اُدھر عشرت خود اوپر آکر چائے کی تیاری میں آکر لگ گئی۔ موقع پاکر اس نے لفافے کو بڑی صفائی سے کھول کر اس کی چٹھیوں کو آگ میں پھینک دیا اور لفافے کو محفوظ کر لیا۔

شیخ انتظار حسین دفتر چلے گئے۔ زرینہ نے ڈرائنگ روم میں آکر بڑی بے فکری سے ایک چھوٹے سے کاغذ پر اسلم کو پیغام بھیجا کہ کل اتوار کو دوپہر کے وقت ضرور ملاقات کی جائے۔ لفافے کو بند کر کے اس پر لکھے ہوئے اڈریس کو کاٹ کر اسلم کے دفتر کا اڈریس لکھ دیا۔ اور لفافے کو محلے کے ایک چھوٹے بچے کے ہاتھوں قریب کے لیٹر بکس میں ڈلوا دیا گیا۔

اتوار کو شیخ انتظار حسین اور بیگم زینت زرینہ کے سسرال چلے گئے۔ سیٹھ امتیاز علی ان کے اس طرح غیر متوقع آنے سے کچھ متعجب سے ہوئے۔ چنانچہ ان کی خاطر داری کرنے سے پہلے پوچھ ہی لیا۔

"سنائیے! آج کیسے آنا ہوا؟"

"ہم آئے تھے۔۔۔ تاکہ جلدی سے اس شادی سے فارغ ہو جائیں"

"آپ بجا فرماتے ہیں۔ مگر ابھی تو تین ماہ باقی ہیں اگرچہ اس دوران میں نصیر کو کسی قسم کا دورہ نہیں پڑا۔ مگر پھر بھی احتیاط ضروری ہے"

یہ تو نہیر معمولی سی بات ہے۔ شادی کے بعد جو لوگ پاگل ہوتے ہیں۔ ان سے تو گزارہ کیا ہی جاتا ہے۔ یہ تو قسمت کی باتیں ہیں۔ انہیں قسمت پر ہی چھوڑ دینا چاہیئے۔ ویسے خدا کے گھر سے امید تو یہی ہے کہ اب کبھی نصیر کو جنوں کا دورہ نہیں پڑے گا"

شیخ صاحب! آپ اپنے کہنے کے مطابق تو ٹھیک ہی کہتے ہیں مگر نصیر بڑا وہمی لڑکا ہے اسے ہر وقت یہی خیال لگا رہتا ہے کہ کہیں میں پھر دوبارہ اس مرض میں گرفتار نہ ہو جاؤں"

"آخر شادی سے اس پر کیا اثر پڑے گا۔ آپ بھی لڑکی والے ہیں اور ہم بھی لڑکی والے ہیں۔ آپ لڑکی والوں کی تمام تر ذمہ داریوں کو اچھی طرح سے جانتے ہی ہیں اس لیے ہمیں ذرا جلدی سے اس کام سے سبکدوش کر دیجیے" بیگم زینت نے دوپٹے کا آنچل اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

دراصل سیٹھ امتیاز علی اندرونی طور پر انہی کے ہم خیال تھے۔ مگر "لڑکی والے" کا خطاب سن کر انہیں ذرا دہ سا ہو گیا اس لیے ظاہری طور پر بھی انہی کے ہم خیال بن گئے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ جلد سے جلد نصیر سے مشورہ کر کے انہیں مطلع کریں گے۔

اسلم بتائے ہوئے وقت کے مطابق آگیا۔ زرینہ نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھاتے ہوئے کہا۔

"توبہ۔۔۔! انتظار کی گھڑیاں کتنی لمبی اور کٹھن ہوتی ہیں مگر اب مجھے یہ شکوہ کرنا نہیں چاہئے کیوں کہ آپ آگئے ہیں۔"

"جونہی میں نے ایک تانگے پر شیخ صاحب کو مع بیگم صاحبہ کے جاتے ہوئے دیکھا فوراً ہی ادھر کو دوڑا۔"

"اسی لیے تو میں حیران تھی کہ آج آپ سفید جھنڈی کو لہراتا ہوا دیکھے بغیر کس طرح ادھر آدھمکے۔"

"آپ کے ارشاد کی تعمیل کے مطابق مجھے ادھر آنا ہی پڑا۔"

خیر آپ کا شکریہ! بس سمجھ لیجئے یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔"

"کیوں کیا اب تم تقدیر کی ہو رہی ہو۔" اسلم نے زرینہ کو متحیر نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں کوشش تو ایسی ہی ہو رہی ہیں۔ مگر اب ہمیں ان کوششوں کو ناکام بنانا چاہیئے۔" زرینہ غم آلود ہو کر بولی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ زرینہ!"

"سب کچھ ہو سکتا ہے چلو آؤ ہم کسی اور شہر میں بھاگ جاتے ہیں وہاں جاکر ہم رشتۂ ازدواج میں شامل ہو جائیں گے۔"

"میں تمہیں ایسے نہیں لے جا سکتا زرینہ!" اسلم نے ان باتوں سے متنفر ہوتے ہوئے کہا۔

"تو آپ پھر کیسے لے جانا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کے پاس کوئی معقول تجویز ہے تو مجھے بھی بتائیے۔ میں اپنے جائز حقوق کی خاطر ہر جائز حربہ استعمال کر چکی ہوں۔

میں آپ کی خاطر اپنے ماں باپ سے جائز طور پر لڑتی رہی مگر انہوں نے ہر ناجائز کارروائی سے ہر جائز میدان میں مجھے پچھاڑنے کی کوشش کی۔ اب اس کے بغیر کوئی چارۂ کار ہی نہیں رہا کہ ان کے سینکڑوں ناجائز کارروائیوں کے بدلے صرف ایک ناجائز کارروائی کو جائز طور پہ عمل میں لائیں۔"

زرینہ نے بجلی کی طرح کوندتے اور بلبل کی طرح چہکتے ہوئے کہا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو زرینہ! مگر میں تمہارے والدین کی بدنامی کا باعث بننا نہیں چاہتا۔"

"انہوں نے بدنام ہونے کی خود کوشش کی ہے۔ اس لیے ان کی کوششوں کو

ناکامی کا منہ دیکھنے دیجئے!"

"مجھے اپنی بدنامی کا کوئی فکر نہیں کم ازکم دنیا یہ تو نہ کہے گی کہ زرینہ بے وفا نکلی!"

زرینہ نے کوئل کی طرح کوکتے ہوئے کہا۔

"دنیا اب بھی تمہیں بے وفا نہیں کہہ سکتی اگر تمہیں کسی نے بے وفا کہا۔ تو میں اس کی زبان کاٹ لوں گا" اسلم شیر کی طرح چنگھاڑتے ہوئے بولا۔

"میں نے اپنے تمام زیورات کو اچھی طرح سے محفوظ کرلیا ہے۔ اب ہم جہاں کہیں بھی جائیں گے۔ کئی سالوں تک کمانے کی فکر ہمارے پاس تک نہیں پھڑک سکے گی" زرینہ پھر لچکدار آواز میں بولی۔

"نہیں زرینہ! میں تمہیں اپنے بازوؤں کی قوت سے کما کر کھلاؤں گا!"

"تو پھر چلئے... میں بھی دیکھوں بھلا آپ کن خوبیوں کے مالک ہیں" زرینہ مسکراتی ہوئی بولی۔

"مگر ابھی وہ وقت نہیں آیا" اسلم نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"تو شاید پھر وہ وقت کبھی نہیں آئے گا۔"

"ایسا نہ کہو زرینہ! اگر اس وقت نے آنا ہے تو ضرور آئے گا"

زرینہ تھوڑی دیر تو کسی سوچ میں غرق رہی اور اس کے بعد بولی۔
"ذرا ٹھہریئے! میں ابھی آتی ہوں"۔ اسلم پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند ساعت بعد زرینہ واپس آ گئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں نفیس قسم کا سیاہ برقع اور دوسرے ہاتھ میں کپڑے کی گٹھڑی سی تھی۔ جس میں زرینہ کی شادی کے تمام زیورات تھے زرینہ کو اس حالت میں دیکھ کر اسلم کی آنکھیں خیرہ رہ گئیں۔ زرینہ شاخِ خمیدہ کی طرح کھڑی تھی۔

"جلدی چلئے! وقت تیزی سے گزر رہا ہے"۔

"نہیں...... زرینہ! کیا آج تم دیوانی تو نہیں ہو گئی!"
اسلم نے غصہ کی حالت میں کہا۔

"نہیں...... آپ مجھ پر یقین نہ کیجئے! میں دیوانی نہیں ہوں"

"تو پھر تم نے یہ حالت کیوں بنا رکھی ہے"

"کچھ نہ پوچھئے! ذرا چلئے"۔

"تم کتنی نادان ہو زرینہ! ابھی تک تمہیں اتنا بھی علم نہیں۔ کہ تم شادی شدہ ہو۔ جب تک شادی شدہ عورت پہلے خاوند سے طلاق نہ لے دوسرے شخص سے شادی نہیں کر سکتی۔ ان حقائق کی رو سے تم میرے ساتھ چل کر کیسے شادی کر سکو گی"۔

" یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ آپ چلیں تو ! "

زرینہ نے باہر دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا !

" ہوں . . . . وہاں جاکر جھوٹ بولو گی " اسلم نے اپنی نظریں نیچی کرتے ہوئے کہا !

" نہیں . . . . زندگی کی مستحکم دیوار جھوٹ دبلو غت اور فسق و فجور کی بنیاد پہ ہرگز کھڑی نہیں کی جاسکتی۔ بلکہ وقت آنے پر قدرت خود بخود کوئی راہ نکال دے گی "۔

" جانتی ہو زرینہ ! جلد بازی ہمیشہ ناکامی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے "

" آپ بجا فرماتے ہیں۔ مردوں کی ہٹ دھرمی ہمیشہ عورتوں کے لیئے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔

" زرینہ ! میں ایسا نہیں کرسکتا " اسلم اٹھتے ہوئے بولا۔

" میری مانیئے ! ہم ایک ہفتہ تک کہیں چھپ جاتے ہیں وہاں ہم دو دوستوں کی طرح رہیں گے بعد میں میں اکیلی گھر آجاؤں گی۔ صاف ظاہر ہے میرے آتے ہی طلاق نامہ بھی گھر پہنچ جائے گا۔ وہ مجبور ہوکر ہم دوستوں کو میاں بیوی بنادیں گے " زرینہ نے اکھڑتے ہوئے سانس لیتے ہوئے کہا !

"نہیں! زرینہ! میں پھر یہی کہوں گا کہ اس حالت میں میں تمہیں نہیں لے جا سکتا" اسلم نے ڈرائنگ روم سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

"میں بڑی حیران ہوں۔ آپ اتنے بزدل کیوں بن گئے ہیں۔ قدرت نے ہر فرد کے بازوں میں وہ قوت عطا کی ہے جس کے سہارے ہر انسان اپنی زندگی کی نیّا کو مشکلات کے سمندر کے بھنور سے کھینچ کر باہر ساحلِ سمندر پر لے آتا ہے۔ قدرت نے ہمیشہ اپنی زندگی خود بنانے کی تلقین کی ہے۔ اور آپ ہیں۔ کہ اپنی زندگی کو سنوارنے کے لیے کسی غیبی امداد کا سہارا ڈھونڈ رہے ہیں"۔

"زرینہ! میرا ایمان یہ ہے کہ اگر ہمارا رشتہ قدرت نے جوڑا ہے تو پھر یہ ایک نہ ایک دن جڑ کر ہی رہے گا۔ اور ہم ایک ہو کے رہیں گے"۔ اسلم نے دروازے کے پاس جاتے ہوئے کہا۔

"ایمان تو میرا بھی یہی ہے۔ مگر وقت کے تقاضے اسے پورا ہونے نہیں دیں گے" زرینہ نے اسلم کے پیچھے جاتے ہوئے کہا۔

"زرینہ! جاؤ!! تمہارے والدین کے آنے کا وقت ہو رہا ہے" اسلم اپنا چہرہ زرینہ کی طرف کرتے ہوئے بولا۔

"میں یہ فیصلہ کر چکی ہوں۔ کہ آپ ہی کے ساتھ جاؤں گی"۔

زرینہ! میں تمہیں اس طرح بھگا کر انسانی شرافت کو قتل نہیں کر سکتا"

بیشتر اس کے کہ زرینہ کوئی معقول جواب دے سکتی اس کے والدین آ چکے تھے جن کا انہیں خطرہ تھا وہی بات ہو کر رہی۔ انہیں دیکھتے ہی اسلم کا دم گھٹنے لگا اس کا بدن لرزنے لگا۔

"اُف کیسی ذلت ... کیسی رسوائی اور بے حیائی۔ بیکر شرافت کو ناگ بن کر ڈس لیا۔ ننگ وناموس کے ذخیرے کو آگ لگا دی۔ دامن شرم وحیا کی دھجیاں اڑا دیں۔ ارے یہاں کوئی ہے! میری بچی کو بھگانے کی کوشش ... ... احمق ... کمبخت ... ناداں لڑکے ...

خدا کرے تیری جوانی اکارت جائے ... تیرا بیڑہ غرق ... تیرا ستیاناس ہو" بیگم زینت نے غصے کی انتہائی آگ میں جل بھن کر زوردار آواز میں کہا۔

" اسلم! یوں دن دھاڑے تمہیں میرے گھر میں اس طرح ڈاکہ ڈالنے کی کس نے اجازت دی" شیخ انتظار حسین نے گرجتے ہوئے کہا۔

"مجھ سے پوچھیئے! میں نے انہیں یہاں آنے کی اجازت دی۔ انہیں

میں نے ایسا کرنے کی ترغیب دی۔ مگر افسوس انہوں نے میری ہر بات کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ اس سے آپ کی بدنامی کو ہوا ملنے کا خدشہ ہے۔" زرینہ آگے بڑھ کر بولی۔

"خاموش رہو نادان لڑکی۔۔۔" بیگم زینت پھر گرجی۔

"نادان لڑکی۔۔۔۔۔۔۔۔ کم از کم آپ سے تو عقلمند ہوں۔ جو اتنا بھی نہیں پہچان سکے کہ میں خود گھر سے بھاگ رہی ہوں۔ یا مجھے بھگایا جا رہا ہے"۔

"خاموش رہو۔۔۔۔ بے شرم۔۔۔۔ تمہیں بہت باتیں بنانی آ گئی ہیں"

شیخ انتظار حسین نے عینک اتار کر اس کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا۔

"میں تو بے شرم ہوں ہی۔۔۔۔۔۔۔۔ مگر ابا تمہیں ایک شریف لڑکے پر یوں غلط الزام تراشتے اور اس قسم کے بے بہا فقرے کستے ہوئے شرم نہیں آتی" زرینہ بجلی کی سی کڑک کی طرح کڑکی۔

توبہ۔۔۔۔۔۔ توبہ۔۔۔۔۔۔ یہ ہے چودھویں صدی کی اولاد! اپنے ماں باپ کو شرم اور بے شرمی کے نسخے بتانے والی بے شرم، بے حیا، زرینہ بس۔۔!!" بیگم زینت نے دوپٹے کا آنچل نیچے کرتے ہوئے کہا۔

"اسلم! میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔" شیخ انتظار حسین پھر گرجے

"اسلم نے مجھے سکھوں کی قید سے چھٹکارا دلایا تھا۔ میں اپنے ان ہاتھوں سے اسلم کو پولیس کی قید کی سلاخوں سے نکال لاؤں گی"۔ زرینہ پھر بجلی کی طرح کوندی۔

شیخ انتظار حسین کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اپنے بائیں ہاتھ کو ہوا میں لہراتے ہوئے بولے:-

"جاؤ! اسی وقت میرے گھر سے نکل جاؤ۔ اب تمہیں کبھی دفتر جانے کی ضرورت نہیں رہے گی... میں تمہیں صرف یہی سزا دیتا ہوں۔ آج سے تم برطرف ہو۔"

اسلم نظریں نیچی کیے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے بڑے دروازے سے باہر نکل آیا۔ شیخ انتظار حسین اور بیگم زینت ڈرائنگ روم میں باری باری گھس گئے۔ زرینہ دوڑتی ہوئی اوپر گئی۔ صندوق میں رکھے ہوئے چالیس پچاس روپوں کو کھڑکی سے جھانکتے ہوئے ایک رومال میں باندھا... جونہی اسلم نیچے سے گزرا

وہ رومال اس پر پھینک دیا۔ اسلم رومال کو اٹھا کر زرینہ کی طرف دیکھنے لگا۔ زرینہ ہاتھ ہلاتے ہوئے کھڑکی سے پیچھے ہٹ گئی۔

پچیسواں باب
(۲۵)

ننھی زرینہ کی نگہداشت کے لیے ایک بوڑھی ملازمہ کا انتخاب کیا گیا۔ جو ہر وقت زرینہ کی چال، ڈھال، رفتار اور گفتار کا خاص خیال رکھتے ہوئے ہر طرح کے حالات سے اس کے والدین کو واقف رکھتی ... زرینہ اگر ادبر ضروریات سے فارغ ہونے کے لیے جاتی تو خادمہ اپنے ہاتھ میں لوٹا، تھامے پیچھے پیچھے ہوتی۔ اگر وہ نہانے کے لیے نیچے آتی تو وہ زرینہ کے

کپڑوں کو بغل میں دبائے ساتھ ساتھ آتی۔ زرینہ اس ضد سے جھنجھلا اُٹھتی۔ مگر کرتی کیا نہ کرتی۔۔۔۔۔ وقت کے تقاضے کے مطابق ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔

دوسرے دن۔ شیخ انتظار حسین پھر زرینہ کے سسرال پہنچے۔ سیٹھ امتیاز علی باہر کے باغیچے میں بیٹھے پاس کی اڑتی پھرتی تیلیوں کی پھرتی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ شیخ انتظار حسین کو آتا دیکھ کر سمجھ گئے۔ کہ وہ کیوں ادھر کیسے آ رہے ہیں۔ شیخ انتظار حسین نے علیک سلیک کی رسم ادا کرنے کے بعد قریب کی پڑی ہوئی کرسی پر اچھی طرح سے بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ ان کے میزبان نے کہا:۔

"آپ نے یونہی آنے کی تکلیف کی! میں خود آپ کے ہاں آکر آپ کو مطلع کر دیتا"

"نہیں۔۔۔ اس میں تکلیف کی تو کوئی بات نہیں۔ ویسے آپ ہمارے ہاں آئیں آپ کا آنا ہمارے لیے باعث مسرت وشادمانی ہوگا۔"

"کل شام نصیر ذرا دیر سے آیا تھا۔ اس لیے صبح ہی صبح میں نے اس سے پوچھا مگر وہ بغیر کوئی جواب دیئے ہی چلا گیا۔ آج شام اس سے ضرور پوچھ کر

کل صبح آپ کے دفتر میں آپ سے ملوں گا۔"

ایک آدھ گھنٹے کی رسمی باتوں کے بعد شیخ انتظار حسین گھر آ گئے۔ شام کا کھانا نصیر اور سیٹھ امتیاز علی نے اکٹھے بیٹھ کر کھایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ دونوں تجارتی امور پہ گفتگو کرتے رہے اور کچھ دیر تک اپنے ملک کی سیاست پہ تنقید و تبصرہ بھی ہوتا رہا۔ جونہی نصیر اس سخن گوئی سے اکتا سا گیا۔ اور اس نے باہر جانے کے لیے اٹھنے کا ارادہ کیا۔ . . دفعتہً سیٹھ امتیاز علی بولے:۔

"بیٹا نصیر! کل تم نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔"

"کونسی بات کا . . . مجھے تو اچھی طرح سے یاد نہیں!"

"شیخ انتظار حسین آج پھر آئے تھے مگر میں انہیں کوئی جواب نہ دے سکا۔"

سیٹھ امتیاز علی نے نصیر کو متحیر نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا

"میں اسی فیصلے پر قائم ہوں۔ جو فیصلہ میں نے آج سے کئی ماہ پہلے کیا تھا۔"

"تمہیں یہ فیصلہ تبدیل کرنا پڑے گا۔ میں نے تمہیں اس فیصلہ پہ نظر ثانی کرنے کے لیے کافی وقت دیا تھا۔"

"خدا معلوم آپ لوگوں کی ذہنیت کو کیا ہو گیا ہے جو ابھی تک اتنا بھی نہ

جان سکے۔ کہ شیخ صاحب کی صاحبزادی کا کردار پست ہے" نصیر نے دایاں پاؤں کرسی پر رکھ ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر کہا۔

"خدا خیر کرے! اب تو تم نجومی ہوتے جا رہے ہو" سیٹھ امتیاز علی نے طنزیہ کہا۔

" لڑکی ایک ناجائز بچہ جننے والی ہے۔ اسی وجہ سے شیخ صاحب کے دن کا آرام اور رات کا چین حرام ہے شیخ صاحب کی شب و روز کی کوشش میرے اس بیان کا بعینہٖ ثبوت ہیں" نصیر ٹھیک نجومی کی طرح بولا۔

چونکہ نصیر نے بات بڑی معقول کی تھی۔ جس کو سنتے ہی سیٹھ صاحب کے کان کھڑے ہو گئے۔ اور وہ نصیر کے اور قریب ہوتے ہوئے بولے:۔ تم کہتے تو ٹھیک ہی ہو مگر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"مگر میں بالکل ٹھیک کہتا ہوں جب انہوں نے متفقہ طور پر چار ماہ کے بعد آنے والی اتوار کو شادی کی قطعی تاریخ مقرر کی۔ تو پھر وہ ایک ہی ماہ کے بعد اتنے پریشان کیوں ہو گئے" نصیر بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"کہنے کو تو تم نے ٹھیک ہی کہا۔ مگر وہ لڑکی ایسی نہیں ہو سکتی ۔ وہ لڑکی بہت شریف ہے" سیٹھ امتیاز علی نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

شریف ۔۔۔۔۔۔ شرف کو چھوڑئیے ! فی زمانہ شریف ہی ایسی ہوتی ہیں ۔"

"مگر ہم تمہارا نکاح کر چکے ہیں اس لیے اب تو کچھ نہیں ہو سکتا ۔"

" ہو کیوں نہیں سکتا ۔۔۔ میں ایسی لڑکی سے ہرگز شادی کرنے کے لیے تیار نہیں ۔ وہ مجھ سے طلاق لے لیں ۔ یا پھر اس کا ڈاکٹری معائنہ کرایا جائے ۔ نصیر بے پروا ہی سے بولا ۔

"اگر ڈاکٹری معائنے میں وہ بالکل بے قصور ٹھہری ۔ تو کیا تم اپنا فیصلہ تبدیل کر لو گے ۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر وہ ڈاکٹری معائنے میں بالکل بے قصور نکلی تو پھر میں اس سے شادی کروں گا ۔" نصیر نے باہر جاتے ہوئے دروازے میں کھڑے ہو کر کہا ۔

دوسرے دن سیٹھ امتیاز علی شیخ انتظار حسین کے دفتر پہنچے ۔ اور انہیں تمام حالات سے آگاہ کیا ۔ شیخ انتظار حسین نے یہ سن کر گنگ رہ گئے ۔ انہوں نے بارہا یقین دلوایا قسمیں کھائیں مگر سیٹھ امتیاز علی نے سر ہلاتے ہوئے کہا ۔" میں نے بہت کوشش کی مگر اسلم اس کے بغیر مانتا ہی نہیں ۔"

آگئی اس میں ان کی زبردست بے عزتی تھی۔ مگر اب نہ وہ طلاق دے سکتے تھے۔ اور نہ کوئی اور راہ اختیار کر سکتے تھے۔ ناچار انہیں یہ قصد کرنا ہی پڑا۔ بیگم زینت بہت جھنجھلائی۔ مگر شیخ انتظار حسین نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

" کوئی بات نہیں۔ اگر خدانخواستہ زرینہ کسی پوشیدہ بیماری کا شکار ہوئی تو اسی بہانے اس کا پتہ چل جائے گا جس سے ہم وقت پر اس کا علاج کرا سکیں گے۔"

چھبیسواں باب (۲۶)

زریناباب کا ڈاکٹری معائنہ سیٹھ امتیاز علی نے اپنے ذریعہ کروایا۔ اس کا ڈاکٹری معائنہ ہر حالت میں قابلِ تعریف تھا۔ ڈاکٹر کی رپورٹ کو نصیر کی نظروں سے گزارا گیا۔ مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔ سیٹھ امتیاز علی نے اسے ایک کاغذ دکھلایا جس کی رو سے نصیر کے نام کا آج تک جتنا بھی بینک بیلنس (BANK BALANCE) تھا۔ اسے سیٹھ امتیاز علی کے بینک بیلنس میں

جمع کردیا گیا تھا۔ اس پروانے کو پڑھ کر نصیر کی چمکتی ہوئی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اسے مجبوراً شادی کا اقرار کرنا پڑا۔ اتوار ۲۲ اکتوبر شادی کی قطعی اور آخری تاریخ متعین ہو گئی۔

دفتر سے اخراج کے بعد اسلم دربدر کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ اس نے ہر دفتر میں جوتیاں چٹخارنے کی کوشش کی مگر ہر دفتر میں اسے منہ کی کھانی پڑی۔ کیونکہ اس کے پاس نہ تو محترمہ "رشوت بانو" کی امداد تھی اور نہ ہی بھیّا "سفارش علی" کی کوئی سفارش! مگر زرینہ کی طرف سے اسے برابر امداد موصول ہو رہی تھی۔ جس سے اس کا گزارہ چل رہا تھا۔ ایک دن اسلم کو سرخ رنگ کے ایک سو روپے کے نوٹ کے ساتھ سفید کاغذ پر لکھا ہوا ایک رقعہ موصول ہوا لکھا تھا:۔

میرے سرتاج!

یہ سوچنے کی ہمت کو شش کرنا کہ یہ ایک سو روپے کا نوٹ میں نے کیسے حاصل کیا۔ کل اتوار ہے۔ میری شادی اور آپ کی جدائی کا دن ہے کل ہمارا گھر بقعۂ نور بنا ہوگا۔ کسی کے دل میں بہار آ رہی ہوگی۔ کوئی اپنے دل کا قرار کھو رہا ہوگا۔ کسی کا دل شگفتہ پھول کی طرح کھل جائے گا اور کسی کے دل

کی کلی کھلنے سے پہلے ہی مرجھا جائے گی۔ مگر ہم ایک بار پھر کوشش کریں گے آپ کل اس کھڑکی والی سڑک پر ذرا آگے گاندھی پارک کے پاس آجائیں میں تمام انتظام مکمل کرلوں گی جب مہمانوں کے پرجوش استقبال پر میزبان اپنی تمام تر توجہ مرکوز کرلیں گے تو میں موقع پاکر آجاؤں گی اور ہم اپنے مستقبل کو پالیں گے اس سے بڑھ کر اور کیا لکھوں لب کانپتے ہیں آرزو مدہوش ہے خط پر آنسو گر رہے ہیں اور قلم خاموش ہے۔

میں آخر میں پھر یہ تاکید کردوں گی کہ کل آنا نہ بھولنا۔

آپ کی بدنصیب

زرینہ احمد !

دوسرے دن زرینہ اپنے وعدہ کے مطابق آنکھ بچا کر نکل آئی۔ زرینہ کی خادمہ نے بھاگ کر شیخ انتظار حسین کو مطلع کردیا۔ شیخ انتظار حسین غصے کی آگ میں جل بھن کر کباب ہو گئے۔

"آج میں اسلم کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ آج میں اسلم کو پولیس کے حوالے کرکے دم لوں گا" یہ کہتے ہوئے وہ بے تحاشا اس کے پیچھے بھاگے۔

اسلم زرینہ کا منتظر تھا۔ زرینہ نے اسلم کے قریب پہنچتے ہوئے کہا۔

"جلدی چلیئے کہیں کوئی پیچھے سے نہ آجائے"۔

"کیا تم وہی زرینہ ہو۔ جسے میں پہلے دیکھا کرتا تھا۔ تم نے آج شفقتِ پدری کا خون کردیا۔ تم نے آج ماں کی مامتا کے دودھ کے ساتھ غداری کی"۔

"یہ وقت باتیں بنانے کا نہیں۔ یہ سیدھی سڑک ہمارا راستہ ہے۔ جلدی چلیئے"!

"نہیں زرینہ! تم نے بہت سخت غلطی کی تمہیں واپس جانا چاہیے"۔

"اب میں کس منہ سے واپس جاؤں گی۔ اگر میں نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔ تو خدا کے لیے اس پر نشتر نہ چلائیے بلکہ مرہم لگانے کی کوشش کریں۔ زرینہ نے آبدیدہ ہوکر کہا۔

"نہیں۔ . . . زرینہ میں تمہیں گھر چھوڑ آتا ہوں۔ بھٹکے ہوئے راہی کو راہِ مستقیم پر لانا سب سے بڑی نیکی ہے" اسلم نے اسے واپس لانے کے لیے پیچھے موڑتے ہوئے کہا۔

"نہیں . . . نہیں . . . . میں آپ کے ساتھ واپس نہیں جاؤں گی۔

ے میری خوابیدہ امیدوں کو جگایا کیوں تھا
دل جلانا تھا۔ تو دل تم نے لگایا کیوں تھا

مجھ کو اس طرح گرانا تھا اگر نظروں سے

پھر میرے عشق کو سینے میں بسایا کیوں تھا"

زرینہ! یہ نہ کہو۔ اگر قدرت نے ہمیں ملانا ہے تو تمہارے سسرال جانے کے بعد بھی ہم ایک نہ ایک دن آپس میں مل جائیں گے۔ جلدی آؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شیخ صاحب کے سر پر رکھی ہوئی عزت کی دستار کے بل گر کر ان کے بازوؤں سے الجھ پڑیں"

شاباش! بیٹا شاباش! کم ازکم یہ ماننا ہی پڑے گا کہ تم جیسا بیٹا فی زمانہ اور کوئی نہیں پیدا ہو سکتا"

زرینہ کے پیچھے شیخ صاحب کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔ پھر زرینہ کے اور قریب آ کر کہا:۔

زرینہ بیٹی! تم نے آج تک میری عزت پر جتنا کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی میں نے تمہیں معاف کیا۔ مگر اب تو چلو۔۔۔ اب تو مجھے بے عزتی کی بھاری ٹوکری اٹھانے سے بچالو"

زرینہ کی شادی ہو گئی۔ وہ روتی۔ دھوتی اور اپنی قسمت کو کھوتی سسرال کے عالیشان بنگلے کی چار دیواری میں پہنچ گئی نصیبر سہاگ رات

منانے کے لیے شاہینہ کے کوٹھے پر چڑھ گیا۔ جب وہ واپس آیا اس وقت اس کی خواہش مردہ ہو چکی تھی۔ وہ آدھی رات کو ڈرائینگ روم پر بے حس ہو کر لیٹ گیا اس نے خواب میں دیکھا :۔

کہ زرینہ دریا کے پل پر کھڑی دریا کی روانی کو ملاحظہ کر رہی ہے۔ نصیر کو کار پر آتا دیکھ کر وہ بھاگ اٹھتی ہے۔ نصیر اس کے پیچھے بھاگتا ہے زرینہ بھاگتے بھاگتے دریا کے کنارے پر پہنچ کر دریا میں چھلانگ لگا دیتی ہے۔ نصیر دریا کے کنارے پر کھڑی کشتی کو کھول کر اس کا پیچھا کرتا ہے۔

جب زرینہ دریا کے وسط میں پہنچتی ہے۔ تو دائیں طرف سے ایک مگرمچھ نمودار ہوتا ہے۔ ایک اور شخص کشتی میں زرینہ کے قریب آتا ہے اور زرینہ کو پکڑ کر نصیر کی کشتی میں بٹھا دیتا ہے مگر زرینہ جلدی سے نصیر کو دریا میں دھکا دے دیتی ہے مگرمچھ نصیر کو دبوچ لیتا ہے۔

نصیر یہ دیکھ کر گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دن کافی چڑھ چکا تھا۔ سورج کی شعائیں کھڑکی سے نصیر کے چہرے پر پڑ رہی تھیں

ستائیسواں باب

نصیر ہر رات اپنے دوستوں کے ساتھ شاہینہ کے گھر جاتا مگر جلد ہی وہ اس بازار سے اکتا گیا۔ سمن آباد میں کرائے پر ایک کوٹھی لی گئی وہ کوٹھی تمام رات عیاشی کا اڈہ بنی رہی۔ ہر رات صوفے سیٹ ترتیب سے لگائے جاتے قالین بچھائے جاتے۔ روپوں کی سیج بچھتی۔ شراب کی بوتلیں کھلتیں۔۔۔۔ ایک سے ایک نئی سے۔۔۔۔۔۔۔ نئی بائی کا

ڈانس ہوتا۔ رقص و سرود کی محفل گرم ہوتی۔ رات کے جلتے ہوئے قمقموں کی روشنی میں لپ اسٹک اور پاؤڈر کے لیپ بجلیوں کی طرح چمکتے۔ رات کی خاموش فضا میں ہر کسی کے گنگھروؤں کی جھنکار سے ہر کسی کے سہاگ لٹنے کی آوازیں آتیں۔ . . . . روپے لٹے جاتے . . . . عصمتیں بکتی جاتیں اور پھر . . . . عصمت کے انہیں سودوں پر تکرار ہوتی۔ جن ہاتھوں سے شرابیں پلائی جاتیں انہی ہاتھوں کی پتلی پتلی انگلیوں اور لمبی لمبی باہوں پر مختلف زاویے بنائے جاتے . . . . طبلے پر تھاپ پڑتی . . . . گنگھروؤں کی جھنکار بجتی . . . . زلفیں بکھر جاتیں . . . . ساتھ بڑھتا جاتا . . . . . سگار سلگائے جاتے . . . . . . ہاتھ لگائے جاتے . . . . جام پکڑائے جاتے اور پھر کوئل کوکتی . . . . . . :-

ے شرابی جا جا جا او دیوانے تو کیا جانے محبت کا نشہ ہے کیا۔ شرابی جا جا جا۔
تیری چھوٹی صراحی میں رکھا ہے کیا۔ کبھی چڑھ کر نہ اترے کچھ ایسی پلا۔ شرابی جا جا جا
جھوٹے خوابوں کی دنیا میں جیتے نہیں۔ دل والے پیالوں میں پیتے نہیں شرابی جا جا جا

"بند کرو یہ بکواس . . . . یہ ہمیں پسند نہیں ہے۔"

ے پیار کریں۔ آ پیار کریں ہم ایک ہیں یہ اقرار کریں
رات سہانی جھومے جوانی سن لے دلوں کی کہانی
پلکوں کے سائے نینوں میں چھائے۔ یہ ہے محبت کی پہلی نشانی۔ پیار کریں آ پیار کریں!

"ختم کرو اس شور کو تم ناپسند ہو گئی ہو۔"

"ناراض نہ ہوئیے سیٹھ صاحب۔ کوئل کو سن چکے۔ اب بلبل کو دیکھئے۔"

استاد میا.... گا.... ما.... پا نے کہا۔

طبلے کی تھاپ ختم ہو گئی۔ گھنگھرو کی جھنکار بدل گئی۔ نیا زاویہ....
نئی جوانی...... نئی زندگی...... نیا خون ...... نوٹوں کی بھرمار
.........اف ہا

ے تیرے لیے دل بے قرار ہے
تیری قسم تجھ سے مجھے پیار ہے
رات یہ جواں تیری میری ملاقات ہے
دیکھ میری آنکھوں میں پیار بھری بات ہے
تیرے لیے دل بے قرار ہے......

اُدھر صبح آذان ہوتی اِدھر گھنگھرو اتارے جاتے...... ادھر

تکبیر کی آواز بلند ہوتی . . . . . . ادھر ہاتھ ملائے جاتے۔ تکبیر کی آواز ختم ہوتی۔ پردے چھپانا شروع کر دیتے۔ بتیاں بجھائی جاتیں قمقمے گل کر دئے جاتے۔ باہنیں ملائی جاتیں . . . اور بستر بچھائے جاتے . . . . . پھر رات یہی ہوتا مگر روز روز کی محفلیں بہت جلد ختم ہو جایا کرتی ہیں۔ سیٹھ امتیاز علی یہ سمجھتے رہے کہ چونکہ آجکل سوت کی بلیک ذرا زوروں پر ہے اس لیے برخوردار نصیر رات کو اپنے کاروبار کو وسعت دینے میں مصروف ہے انہیں یہ کیا معلوم تھا کہ ان کے شام کا کاروبار بشرا بائی کی چال، ڈھال، رفتار اور گفتار پر ختم ہو گیا۔

تھوڑے ہی عرصہ بعد نصیر کا دل ان طوائف زادیوں سے اکتا گیا اس کے دوستوں نے کرائے کی بیویاں مہیا کر دیں۔ جب طوائف کو وہ سو روپے پر لاتے اسی کے ایک ہزار روپے نصیر سے اینٹھتے۔ جہاں کاروبار کا دخل ہوتا ہے وہاں کاروباری مصلحتیں بھی مہیا ہو جایا کرتی ہیں۔ کرائے کی طوائفوں کو لانے کی بجائے انہوں نے راستے میں چلنے والی برقعہ پوش دوشیزگان کو اپنی ہوس کا آلہ کار بنایا

"لو سیٹھ!! آج ہم ایک نئی بلبل لایا۔ مگر وہ پانچ ہزار روپے مانگتا ہے۔"

"پانچ ہزار! بھیج دو واپس یہ بلبل اس پنجرہ کے قابل نہیں۔"

"نہیں سیٹھ یہ بلبل واپس بھیجنے والا نہیں اگر یہ ایک بار اڑ گیا تو پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔"

"مگر یہ کاروبار آخر کب تک جاری رہے گا۔" نصیر سگریٹ پھینکتے ہوئے بولا۔

"بہت جلد ختم ہو جائے گا۔ تم اپنی بیوی کے پاس نہیں جاتی ہے۔ تمہارا بیوی اپنا باپ کو بولتا ہے۔ ہمارا مرد... نامرد ہے۔ ہم طلاق مانگتا۔ تو بس تمہارا طلاق ہو جائے گا۔ اور تم اپنی پسند کی نئی بلبل کو اپنا بیوی بنانا۔"

ہر روز راہ پر چلنے والی عصمتیں یوں برباد ہوتی رہیں۔ نصیر گھنٹوں کوٹھی میں بیٹھا سگریٹ سلگاتا رہتا اس نے فیصلہ کیا آج سے وہ خود ان کے ساتھ جایا کرے گا۔

لاہور ریلوے اسٹیشن کے بڑے دروازے پر ایک سیاہ پوش آ کھڑی ہوئی :۔

"ٹانگہ ادھر آئے۔"

مگر پیشتر اس کے کہ ٹانگہ اس کے پاس آتا ایک سیاہ کار اس کے آگے آکر رک گئی۔ پیچھے سے دروازہ کھلا۔ کریم دوسری طرف کے دروازے سے اس کے پیچھے آکر رک گیا۔ اس نے دوسری طرف جانے کے لیے اپنا رخ بدلا۔ مگر کریم کے ایک ہی دھکے نے اسے کار کے اندر پھینک دیا۔ اور اسی کے ساتھ کریم بھی کار میں کود پڑا۔ کار جلدی۔ دروازے بند ہو گئے مگر وہ برابر چیختی رہی۔ سلیم نے جلدی سے اپنا رومال اس کے منہ پر باندھ دیا۔ کریم اور رحیم نے اس کی باہوں اور ٹانگوں کو اچھی طرح اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ برابر چیختی اور ہاتھ پیر مارتی رہی۔ نصیر اس کی یہ حالت دیکھ کر بدحواس ہو گیا۔

"سلیم پیچھے دیکھنا کہیں پولیس تو نہیں ہمارا پیچھا کر رہی"۔ نصیر نے کار کو تیز کرتے ہوئے گھبرا کر کہا۔

"اجی! پولیس کو پیچھے آنے کی کیا ضرورت ہے یہ سالی ہے! کہ چپ ہونے کا نام نہیں لیتی"۔

اٹھائیسواں باب

وہ اس برقع پوش کو سمن آباد کی کوٹھی میں لے آئے۔ اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر تین آہنی مردوں کے مقابلے میں ایک صنفِ نازک کیا کر سکتی تھی۔ اسے مردہ لاش کی طرح دھڑام سے بیڈ پر پھینک دیا گیا۔ اور لفضیر لباس تبدیل کرنے کے لیے دوسرے کمرے میں چلا گیا لباس تبدیل کرتے ہی اس نے شراب کے جام پینے شروع کر دیئے۔ جب

وہ خوب نشے میں مدہوش ہو گیا۔ تو وہ لڑکھڑاتا ہوا ڈرائنگ روم ہی سے باہر نکلا۔ سلیم اس کے لیے شراب کی ایک اور بوتل پکڑے کھڑا تھا۔ "سناؤ سلیم!! آج کا بلبل کتنا روپیہ مانگتا؟"

"خاک روپیہ مانگتا۔ وہ ماننے کا نام ہی نہیں لیتا، وہ چیختا، چلاتا، گالیاں بکتا اور ہاتھ پاؤں مارتا۔ ہاتھ لگانے کا نام ہی نہیں لیتا"۔

"بند کر دیہ بکواس: ہم یہ سننا نہیں چاہتے۔ تم نے سارے مزے کو خراب کر دیا ہے" نصیر نے لڑکھڑا کر اس کے ہاتھ سے بوتل پکڑتے ہوئے کہا۔

دوسرے کمرے سے برابر شور و غوغا بلند ہو رہا تھا نصیر وہیں کھڑے کھڑے آدھی بوتل کو گھٹ گھٹ کر کے پی گیا۔

"بند کرو اس شور کو تمہارے اس شور سے کانوں کے پردے پھٹے جاتے ہیں" نصیر نے دروازے کے قریب آتے ہوئے کہا۔ مگر صنفِ نازک کی چیخیں برابر بڑھتی جا رہی تھیں۔ اسلم نے دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔

ے • شبِ وصال ہے گل کر دو ان چراغوں کو
• خوشی کی بزم میں کیا کام جلنے والوں کا

تمام بتیاں گل کر دی گئیں۔ دیوار کے پاس ایک بڑا گلوب روشن تھا۔ اس گلوب کے آگے ایک صوفہ پڑا ہوا تھا۔ وہ اس تبدیلی سے بہت گھبرا گئی۔ اس کا پورا وجود تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اتنی بڑی غنڈہ گردی کے باوجود وہ اپنے برقعہ میں لپٹی رہی۔ نصیر کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کے ساتھیوں نے باہر سے دروازے کو بند کر دیا۔ ایک شرابی کو نشے میں مدہوش ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ دوڑ کر ایک کونے کے ساتھ جا لگی۔ گلوب کی روشنی صرف اسی صوفے پر پڑ رہی تھی۔ باقی تمام کمرے میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اس نے باقی ماندہ شراب کے گھونٹ پی کر بوتل کو فرش پر پھینک دیا۔

"آؤ میری جان ہم شبِ وصال منائیں"۔ نصیر نے اپنے بازو ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔

"تیری جوانی اکارت جائے۔ خدا تجھے تہس نہس کرے"۔

"ہاہاہا۔۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ ہاہاہا۔ مجھ کو تہس نہس کرے یا تجھ کو"

نصیر نے بے تحاشا قہقہے لگاتے ہوئے کہا

"تجھ کو ظالم انسان تجھ کو! اگر میری طرح تیری بہن کو یوں اغوا کر لیا جاتا تو اس وقت تیرے دل پر کیا گزرتی" اس نے اپنی کپکپاتی ہوئی آواز میں لرزش پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"ہاہاہا...... ہاہاہا...... ہاہاہا میری بہن تو اس وقت گہری نیند میں مدہوش ہوگی"۔ نصیر نے اس کے قریب جاتے ہوئے کہا۔

"مجھ کو ہاتھ نہ لگانا بدکار انسان میں تجھے جان سے مار ڈالوں گی"۔

"خاموش رہو ناداں لڑکی! تو ابھی یہ بھی نہ دیکھ سکی کہ اس وقت، تم کہاں کھڑی ہو"۔

"میں ایک بدکار انسان کی قید میں ہوں۔ قدرت مجھے یہاں سے آزاد کرائے گی۔ میں اپنے پاک جسم پر تیرے ناپاک ہاتھ نہیں لگنے دونگی میں مر جاؤں گی مگر اپنی عصمت محفوظ رکھوں گی" اس نے اور پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

"یہاں تم جیسی کئی تمہاری بہنیں آئیں اور چلی گئیں۔ مگر کسی کی عصمت محفوظ نہ رہ سکی۔ تم اپنی عصمت کو کیسے محفوظ رکھو گی"۔

نصیر نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"خبردار آگے مت بڑھنا۔ میں دیوار سے ٹکرا کر مر جاؤں گی۔ مگر تجھے ہاتھ تک نہیں لگانے دوں گی۔"

نصیر اس کے قریب آتے ہوئے بولا :-

ے • تسکینِ محبت کے بس دو ہی طریقے تھے
• یا تم نہ حسین ہوتی یا میں نہ جواں ہوتا۔"

وہ بروقت چیخی ع

"ستمگر یاد رکھ رونا میرا رنگ لائے گا"

اتار دو اس برقع کو ان ریشمی تاروں میں کوئی عصمت نہیں ہے۔"

نصیر نے اس کے اور قریب ہوتے ہوئے کہا

"الہی! تیرے ہاتھ ٹوٹ جائیں۔ تجھے موت کیوں نہیں آتی" اس نے زور زور سے چیختے ہوئے کہا۔

نصیر نے آگے بڑھ کر اس کو دونوں باہوں سے پکڑ کر زور سے جھٹکا دے کر پرے رکھے ہوئے صوفے پر پھینک دیا۔ اور خود لڑکھڑا کر پیچھے دیوار کے ساتھ جا لگا۔

سے "سانپ سب ڈس لینے کی ممکن ہے کہ عادت چھوڑ دیں •

پر نہیں ممکن ارادہ مابدولت۔ چھوڑ دیں" •

یہ کہنے کے ساتھ ہی اس نے اس کے برقع کے پردہ کو پکڑ کر کھینچ ڈالا۔

مگر وہ چیخی

"بھیا نصیر"

نصیر اسے دیکھتے ہی لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔

"ناہید تم یہاں"

"آج معلوم ہوا تم کس عزت کے مالک ہو۔ کیا اسی لیے اپنی بیوی پر الزام تراشیاں کرتے تھے" ناہید نے صوفے پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

ناہید مجھے معاف کر دینا۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے ... اس میں میرا کوئی قصور نہیں ... اس میں میرا کوئی قصور نہیں" نصیر نے یہ کہتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی مگر کثرتِ شراب نوشی کے سبب پھر فرش پر گر پڑا

نصیر کے ساتھیوں نے پریشانی کے عالم میں دروازہ کھولا نصیر اوندھے

منہ قالین پر گرا ہوا تھا۔ سلیم نے آگے بڑھ کر نصیر کو اپنے سہارے سے کھڑا کیا۔

دُور ہو جاؤ۔ دفع ہو جاؤ میری نظروں سے تم نے مجھے ذلیل کرنے کی کوشش کی۔ تم نے مجھے بدنام کر دیا۔ تم نے مجھے بُرا آدمی بنا دیا۔ اب میں کسی کو منہ نہیں دکھا سکتا۔ اب میں کیسے گھر جاؤں گا۔ میری بیوی کیا کہے گی۔ میں نے اپنی بیوی کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ اب وہ میری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گی۔ ہاہاہا... ہاہاہا... ہاہاہا وہ کہے گی تو شرابی ہے۔ تو پاجی ہے۔ تو رنڈی باز ہے۔ تو عورتوں کے پاس جاتا ہے اور عورتیں تیرے پاس آتی ہیں ہاہاہا ہاہاہا ہاہاہا وہ مجھ سے خوف کھائے گی...... وہ کہے گی تو وحشی ہے۔ تو کمینہ ہے تو بدکار ہے۔ ...... جاؤ! میری بہن ناہید کو گھر پہنچا آؤ اب میں کبھی بھی گھر نہیں جاؤں گا۔ یہ شراب کی بوتل میری بیوی ہے۔ میں تمام عمر اسی کے پاس رہوں گا۔

نصیر نے ٹھیٹھ شرابی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔“ وہ شراب کے نشے میں اس قدر مدہوش ہو چکا تھا کہ قطعاً نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا بک

رہا ہے اور کیا کر رہا ہے۔ نصیر کے تینوں دوستوں نے آنکھ سے آنکھ ملائی۔ آپس میں سرگوشی کی اور ناہید کو لے کر گھر چھوڑنے چلے گئے۔

انتیسواں باب (۲۹)

زرینہ کے سسرال چلے جانے کے بعد اسلم کا چند دن تک زرینہ کی طرف سے گاہے بگاہے ملنے والی امداد سے گزارہ چلتا رہا۔ مگر جلد ہی یہ امداد بھی ختم ہو گئی اور امدادی فنڈ بھی!

ایک دن اسلم پر ایسا بھی آیا۔ جب اس کی جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں تھا وہ سارا سارا دن مختلف دفتروں میں ملازمت کی خاطر چکر لگاتا

رہتا تھا مگر ہر دفتر میں اسے دھکوں کے سوا کچھ نہ ملا۔ پیٹ میں بھوک کی وجہ سے بل پڑ رہے تھے۔ ٹانگیں شدتِ درد سے اینٹھ گئی تھیں۔ مگر اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی جس سے وہ پیٹ کے تنور کی آگ بجھا سکتا۔

اُس نے اپنے دل سے باتیں کرتے ہوئے کہا اب میں کہاں جاؤں زرینہ بھی نہ رہی۔ جس کے آگے میں اپنا ہاتھ پھیلا دیتا۔ جیب میں پیسہ بھی نہ رہا جس سے ہوٹل کا کرایہ ادا کیا جا سکے۔ وہ ایسی ہی باتیں اپنے دل سے کرتا ہوا گول باغ میں جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے بہت تدبیریں سوچیں مگر پھر بھی اس کا ذہن کچھ نہ سوچ سکا۔ سورج اونچے اونچے درختوں کی اوٹ میں چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اندھیرا اجالے پر اور اجالا اندھیرے پر فوقیت لے جانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا۔ اسلم کے قریب ہی چند بچے گیند سے کھیل بھی رہے تھے اور لڑ بھی رہے تھے۔ ان کی گیند بار بار اسلم سے ٹکراتی مگر اسلم ایک ساکن وجود لیے بیٹھا تھا۔

اندھیرا بڑھتا گیا۔ اسلم کے سامنے آٹھ نو سال کا ایک ہونہار لڑکا کھڑا تھا۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ بال بکھرے ہوئے تھے

اور ہاتھ سرخ اور سیاہ رنگ کے داغوں سے داغدار تھے۔ اس نے
چھوٹا سا لکڑی کا ڈبہ زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔

"بابو جی! بوٹ پالش!!"

"اسلم نے سر ہلا کر نفی میں جواب دیا۔

"بہترین بوٹ پالش! صرف دو آنے میں!"

"نہیں... بھئی! مجھے ضرورت نہیں"!!! اسلم نے پھر سر ہلاتے ہوئے
کہا۔

"اچھا صرف ایک آنہ دیجئے"۔

"میرے پاس پیسے ہی نہیں ہیں"۔ اسلم پھر سر ہلا کر بولا۔

"تو صرف دو پیسے ہی دے دینا"

"نہیں... اب جاؤ بھئی! اسلم نے خشم آلود نگاہوں سے
اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا کل دے دینا۔ پرسوں دے دینا" اس نے جاتے ہوئے کہا۔

اسلم وہیں لیٹ گیا۔ صبح کو اٹھا تو اس کا بُرا حال تھا۔ گو بھوک
کی وجہ سے اس میں قدم اٹھانے کی طاقت نہ تھی لیکن وہ ہمت کرکے

آہستہ آہستہ اٹھتا بیٹھتا گرتا پڑتا قدم اٹھاتا مال روڈ سے گذر رہا تھا سامنے سے ایک کار آتے ہوئے اس کے پاس آکر رک گئی۔

"ہیلو مسٹر اسلم! گوڈ مارننگ!! میں دور سے دیکھ ہی رہا تھا۔ کہ آپ ضرور اسلم صاحب ہوں گے۔ مسلم لیگ کے اسلم"۔ نصیر کار کا دروازہ کھول کر مسکراتا ہوا اسلم کے قریب آکر بولا۔

"گوڈ مارننگ مسٹر نصیر! آج کا دن کتنی خوش قسمت ہے کہ پورے تین سال کے بعد آپ سے ملاقات نصیب ہوئی۔ دراصل آدمی زندہ ہو تو کبھی نہ کبھی ضرور مل جاتا ہے"۔

"سو گڈ۔ . . . . ویری گڈ . . . . . کیا آپ پاکستان بننے کے فوراً بعد لاہور آگئے تھے میں تو سمجھتا تھا کہ آپ"۔ . . . .

"ہماری قسمت۔ بس موت کہاں بچتے بچاتے پاکستان میں پہنچ ہی گئے"۔

"میں بھی بڑی مشکل سے پاکستان آیا تھا۔ اچھا سناؤ یار آجکل کہاں رہتے ہو"۔

"ہم نے کہاں رہنا ہے والدین دہلی میں موت کے منہ کا نوالہ بن گئے اور

ہم لاہور میں موت سے مقابلہ کر رہے ہیں۔" اسلم نے کار کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے کہا

"اوہو۔۔۔۔۔۔ ویری بیڈ لک۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آپ واقعی بہت مظلوم ہیں چلو آؤ چائے پیئیں"۔

اسلم بغیر کسی تکلف سے اس کے ساتھ "کافی ہاؤس" چائے پینے کے لیے چلا گیا

"آپ آجکل کہاں ملازم ہیں"۔ نصیر نے گرم چائے کا پہلا گھونٹ حلق سے نیچے گراتے ہوئے پوچھا۔

"ملازمت کہیں ملتی ہی نہیں۔ آج بھی ریلوے ہیڈ کوارٹر میں انٹرویو کے لیے جانا ہے"۔ اسلم نے توس کو دانتوں کے نیچے دباتے ہوئے جواب دیا۔

"سفارش کے بغیر اس دنیا میں کوئی کام نہیں بنتا۔ وہاں پر بابو عبدالمجید صاحب میرے بہت اچھے واقف کار ہیں۔ میں انہیں ابھی فون کر دوں گا۔ آپ انٹرویو کے دوران ان سے میرا ذکر کر دیں" نصیر نے چائے کی پیالی زبردستی حلق کے نیچے اتارتے ہوئے کہا۔

اسلم ریلوے میں ملازم ہو گیا۔ گورنمنٹ کی طرف سے دیئے گئے کوارٹر میں اسلم رات کو بڑی بے فکری سے لیٹا ہوا تھا۔ دفعتاً اس کی آنکھ مسلسل چیخ و پکار سے کھل گئی۔ اسلم ایک دم کمرے سے نکل کر صحن میں آیا۔ شور و غل متواتر بڑھ رہا تھا۔ اسلم نے اس شور سے متعجب ہوتے ہوئے کہا:۔

"الٰہی! خیر کرنا۔ آج پہلے ہی دن یہ قیامت!"

اسلم کا خیال تھا۔ شاید برابر والا کوارٹر ڈاکہ زنی کرنے والوں کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ مگر جلد ہی اسے یہ خیال بدل دینا پڑا کہ ایک نسوانی آواز چلّا چلّا کر اپنی عصمت کو بچانے کی کوشش میں سرگرداں تھی۔

"او! ظالم انسانو!! جس کا نمک کھا کر تم پلے ہو آج اس کی بہن کی عصمت لوٹتے تمہیں شرم نہیں آتی"!

"خاموش رہو! اگر تم نے اب آواز نکالی تو تمہاری زبان کاٹ دوں گا۔ ہم کچھ نہیں جانتے تم کس کی بہن ہو"۔

"خدا جانے تمہارے دلوں میں کیوں رحم نہیں آتا۔ ۔ ۔ کیا تمہارے گھروں میں مائیں بہنیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور بیٹیاں نہیں!!!"

"سب کچھ ہے۔ صرف تمہاری کمی تھی۔ وہ اب پوری ہو جائیگی۔ تم نے آج رات ہمیں بہت تنگ کیا ہے اب تمہارے سامنے نصیر نہیں بلکہ نصیر کے تین ساتھی کھڑے ہیں"۔

"خدا کے لیے مجھ پر رحم کھاؤ اُس کے صلے میں نصیر سے بڑے سے بڑا انعام دلوا دوں گی"۔

ہاہاہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاہاہا۔ ۔ ۔ ہاہم نے نصیر سے جو انعام لینا تھا وہ لے چکے ہیں"

اِن تینوں نے وحشیوں کی طرح قہقہے لگاتے ہوئے کہا۔ نصیر کا نام سنتے ہی اسلم کا دل کانپ اٹھا۔ ان لوگوں نے ضرور اس کی بہن کو اغوا کیا ہے" یہ کہتے ہوئے اس نے برآمدے کوارٹر کے صحن میں چھلانگ لگا دی۔ اس کے چھلانگ لگاتے ہی اندر سے آواز آئی :-

"کیا پولیس آگئی"؟

اسلم نے فوراً موقع کی نزاکت کو بھانپ لیا۔ وہ ایک کونے میں چھپ گیا۔ جہاں مکمل اندھیرا ہونے کی وجہ سے اسے کوئی دیکھ

نہیں سکتا تھا جونہی ان میں گھبراہٹ بڑھی۔ اسلم نے پکار کر کہا۔

"پولیس.... پولیس کوارٹر کے گرد گھیرا ڈال لو... خبردار کوئی نکلنے نہ پائے"۔

یہ الفاظ سنتے ہی وہ بے تحاشا باہر کو دوڑے اور دیوار کے ساتھ ہٹتے ہوئے انہوں نے اسلم کے کوارٹر میں چھلانگ لگا دی۔ اسلم کمرے میں داخل ہوا ایک دوشیزہ کو رسیوں کے ساتھ چارپائی پہ لٹا کر باندھا ہوا تھا۔ اسلم نے جھٹ پٹ رسیوں کو کھول کر اسے آزاد کیا ناہید نے اس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔

"یہ وقت شکریہ ادا کرنے کا نہیں۔ چلیئے میں آپ کو گھر چھوڑ آتا ہوں"۔

باہر نصیر کی کار کھڑی تھی۔ ناہید نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا:۔

"کیا پولیس نہیں آئی؟"

"نہیں محترمہ میں ساتھ والے کوارٹر میں رہتا ہوں۔ آپ کی چیخوں کی آواز نے مجھے بیدار کر دیا۔ جونہی میں دیوار سے کودا تو انہیں پولیس کا شبہ ہوا۔ چنانچہ میں نے پولیس پولیس کا شور مچا کر انہیں بھگا دیا" اسلم نے کار ڈرائیو کرتے ہوئے جواب دیا۔

اسلم کار کو مختلف کوارٹروں سے گھماتا ہوا ریلوے سٹیشن لے آیا۔ قریباً تمام دوکانیں بند ہو چکی تھیں۔ البتہ کارپوریشن کی لگی ہوئی بتیاں جل رہی تھیں۔

"مجھے اسی جگہ سے اغوا کیا گیا تھا۔ اس وقت یہاں بہت چہل پہل تھی۔ مگر اب یہاں کوئی آدمی دکھائی نہیں دیتا" ناہید نے کار کی کھڑکی کا شیشہ نیچے کر کے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

آپ کہاں رہتی ہیں تاکہ میں کار کا رخ تبدیل کر لوں۔

"ہمارا بنگلہ یہاں سے دور ہے کہیں ایسا نہ ہو گھر والے آدھی رات کے وقت مجھے آپ کے ساتھ دیکھ کر آپ پہ کچھ شک کریں۔"

تو پھر آپ کہاں جائیں گی" اسلم نے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں آج کی رات آپ کے ہاں ٹھہر جاؤں گی"

"چلئے پھر کسی ہوٹل میں چلتے ہیں۔" اسلم نے کار کو دوبارہ سٹارٹ کرتے ہوئے کہا

"مگر آپ نے کہا تھا کہ میں ساتھ والے کوارٹر میں رہتا ہوں۔"

"میرے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے انہوں نے دیوار پھاند کر

میرے ہی کوارٹر میں چھپنے کی کوشش کی تھی ۔"

"اُوئی ...... میں مرگئی .... پھر تو وہ لوگ آپ کی بیوی کو تنگ کر رہے ہوں گے ۔" ناہید نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"میری بیوی نہیں ہے ۔" اسلم نے پھر تیجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ کیا آپ شادی شدہ نہیں ہیں"

"نہیں ...... میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے ۔" اسلم نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ان دونوں نے قریب کے ریسٹورینٹ میں رات کاٹنے کے لیے ایک کمرہ کرائے پر لیا۔ ناہید نے پورے خلوص سے اسلم کو تمام واقعات سنائے۔

" کہ کس طرح اس کے بھائی نے اسے اغوا کرنے کی کوشش کی مگر جونہی اس نے مجھے بے نقاب کیا۔ اس کا سارا نشہ ہرن ہوگیا۔ اس نے اپنے دوستوں کو مجھے گھر پہنچانے کے لیے میرے ساتھ روانہ کیئے مگر اس کے دوست مجھے گھر پہنچانے کی بجائے اپنے ایک دوست کے پاس اس کوارٹر میں لے آئے تاکہ میری عصمت پر ڈاکہ ڈالا جائے ۔"

اسلم نے ناہید کو اپنی زندگی اور محبت کے واقعات سنائے۔

اس نے بتایا:۔

زرینہ بے وفا نہیں ہے اور آج بھی اس کی محبت اسلم کے سینے میں چنگاری کی طرح سلگ رہی ہے۔

(۳۰)
تیسواں باب

نصیر کے دوستوں کا خیال تھا کہ اب نصیر کبھی گھر نہیں جائے گا اس لئے انہوں نے ناہید کو ہمیشہ کے لیے اپنا بنانے کی کوشش کی تھی مگر اس رات نصیر شراب کے نشے میں گھر چلا گیا زرینہ کھڑکی میں کھڑی اسلم کا انتظار کر رہی تھی۔ نصیر کو یوں بدحواس دیکھ کر وہ بجلی کی طرح چمک اُٹھی۔

"بس اب میں اسے شرابی کبابی اور بدمعاش کا خطاب دے کر طلاق کا

مطالبہ کروں گی میں صبح ہی صبح گھر جا کر احتجاج کروں گی کہ میں ایک شرابی کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی کیوں کہ جہاں شراب آتی ہے وہاں ہر برائی آجایا کرتی ہے۔

نصیر لڑکھڑاتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا اس نے زرینہ کو بھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا تھا۔ زرینہ کو برآمدے میں کھڑا دیکھ کر اسے شبر گزرا کہ یہ اس کی بہت ناہید ہی ہے۔

"مجھے معاف کر دینا ناہید! . . . مجھے معاف کر دینا!! انہوں نے کہا تھا کہ میں تمہیں اغوا کروں۔ انہوں نے تمہیں کچھ نہیں کہا وہ تمہیں میری بہن سمجھتے ہوئے یہاں چھوڑ آئے۔ ورنہ وہ ضرور تمہیں بھی تنگ کرتے!!

یہ سنتے ہی زرینہ کا چہرہ شگفتہ کلی کی طرح کھل گیا۔ اور اس کے رخسار نہ معلوم خوشی سے سرخی مائل ہوتے گئے۔

"اب تو تجھے ضرور ہی طلاق ہو جائے گی۔ اس نے بڑی نفرت سے اپنا چہرہ دوسری طرف کرتے ہوئے کہا۔

ہنسی ہنسی دیتی ہوئی دوڑتی ہوئی عقبی کمروں میں گئی اور اپنی ساس کے دروازے کو کھٹکھٹایا۔ تمام اہل خانہ بیدار ہو گئے۔

ناہید اپنے ظالم اور بدکار بھائی کے ہاتھوں اغوا ہو گئی ہے۔"

"اوئی اللہ...... یہ آج تم کیا کہہ رہی ہو زرینہ!"

"یہ زرینہ نہیں بلکہ آپ کا اپنا بیٹا نصیر کہہ رہا ہے۔ جا کر دیکھئے وہ شراب کے نشے میں مدہوش وحشیوں کی طرح سیڑھیوں میں لیٹا ہوا ہے" زرینہ نے بجلی کی طرح کڑکتے ہوئے کہا۔

آدھی رات کے وقت تمام گھر میں کھلبلی مچ گئی۔ ملازموں کو اٹھا کر تمام شہر میں بھگایا گیا۔ پولیس کے اعلیٰ حکام کو ٹیلی فون کئے گئے۔

دوسرے دن صبح کر سیٹھ امتیاز علی موٹے موٹے شیشوں کی عینک لگائے اخبار "نوائے وقت" میں اغوا کے واقعات کو بڑی سنجیدگی سے پڑھ رہے تھے مگر ناہید کا کہیں بھی نام نہیں تھا۔ ناہید نے پیچھے سے آکر سیٹھ امتیاز علی کی آنکھوں کو اپنے نرم نرم ہاتھوں سے دبا لیا۔

"چھوڑو تم کون ہو" ! سیٹھ امتیاز علی نے جھنجھلا کر کہا۔

"ابا جان !! السلام علیکم !!" ناہید ہاتھ چھوڑ کر مسکرانے لگی۔

"بیٹی ناہید ! تم آگئی ہو"۔ سیٹھ امتیاز علی نے حیران ہو کر کہا۔

"ابا جان ! میں تو کل ہی آگئی تھی خالہ جان نے بہت کہا کہ ایک دو دن اور

ٹھہر جاؤ مگر میں بضد ہو کر چلی آئی ریلوے اسٹیشن پر تانگے میں سوار ہوتے وقت آپ کے بیٹے کے ہاتھوں اغوا ہوئی۔ وہاں چیخی چلائی تو اس کے دوستوں نے میری عصمت کو برباد کرنے کی کوشش کی اس اسلم نے جسے آپ کا بیٹا ہی کہنا چاہئے اپنے بازوؤں کی قوت اور غیرت ملی سے مجھے بھی محفوظ کیا اور میری عصمت کو بھی!"

"آؤ بیٹا اسلم! میں نے تمہیں دیکھا ہی نہیں"!

سیٹھ امتیاز علی نے اسلم کو اپنے پاس صوفے پر بٹھایا۔ نصیر بھی منہ لٹکائے سامنے کھڑا تھا۔ ملازموں نے چائے کے برتنوں کو میز پر سجا دیا۔ ناہید دوڑی ہوئی زرینہ کے کمرے میں گئی مگر معلوم ہوا زرینہ اپنے میکے گئی ہوئی ہے۔ ناہید اس کار پر زرینہ کو لینے کے لیے گئی۔ واپسی پر اس نے زرینہ سے سب کچھ دریافت کر لیا۔ جب زرینہ سب کچھ بتا چکی تو ناہید نے بالکل بچوں کی طرح منہ بناتے ہوئے کہا۔

"جب تمہاری شادی تمہاری مرضی کے خلاف ہو رہی تھی تو تم اس وقت چیخی اور چلائی کیوں نہیں تھی۔ تم نے اس وقت شور و غل کیوں نہیں مچایا تھا۔ تم نے اس وقت تڑپ ۔ ۔ ۔ ۔ تڑپ کر احتجاج کیوں نہیں

کیا تھا۔"

" کیا کرتی بہن :۔

؎ مکان میں آگ لگی پاسبان نے کچھ نہ کہا
چمن میں دام بچھایا باغبان نے کچھ نہ کہا
میں پھنس کے چل گئی لیکن زبان نے کچھ نہ کہا
ستم کی تیغ چلی ماں باپ نے کچھ نہ کہا

ناہید نے زرینہ کو ڈرائنگ روم کے باہر کھڑا کر دیا اور خود اندر جا کر مسکراتے ہوئے اسلم سے پوچھنے لگی۔

" بھیا اسلم ! تم اب شادی کیوں نہیں کرتے"۔

اسلم نے بڑے شاعرانہ انداز میں جواب دیا۔

؎ "کوئی کیوں کسی کا لبھائے دل کوئی کیا کسی سے لگائے دل
وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے"

ناہید نے فوراً دروازے پر لگے ہوئے پردے کو سرکا دیا۔ زرینہ اسلم کو دیکھ کر بجلی کی طرح کوندتی، کوئل کی طرح کوکتی، خوشبو کی طرح مہکتی اور بلبل کی طرح چہکتی ہوئی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

"ہائے سلمیٰ ! تم یہاں !!!"

"ممی ڈیڈی ! تم کہاں !!!"

"آپ یہاں کیسے آئے اپنے ساتھ تمام خوشیاں بھی لیتے آئے۔"

سیٹھ امتیاز علی اور نصیر ایک دوسرے کو یوں دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ اچانک سیٹھ امتیاز علی کی نظر اسلم کے دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی پر پہنی ہوئی انگوٹھی پر پڑی۔

اسلم ! یہ انگوٹھی تمہارے پاس کیسے آگئی۔ یہ تو میں نے زرینہ کو نکاح کے وقت پہنائی تھی۔" سیٹھ امتیاز علی نے اسلم کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا

"صرف اس لیے کہ اب ہائے سلمیٰ اپنے نکاح کے وقت زرینہ کو پہنا دے" ناہید ہنستے ہوئے بولی۔

"چلو آؤ اسلم ! اب ہمیں کوئی جُدا نہیں کر سکے گا۔"

"نہیں . . . . اس طرح نہیں . . . . پہلے نصیر سے کہو کہ میں تمہیں اتنی ہی بُری لگتی ہوں تو مجھے طلاق ہی کیوں نہیں دے دیتے۔ اور بیٹا نصیر تین بار کہے کہ میں نے تمہیں طلاق دی . . . . میں

نے تمہیں طلاق دی۔ . . . . میں نے تمہیں طلاق دی۔"

ٹھیک اسی وقت شیخ انتظار حسین اور بیگم زینت پسینے سے شرابور چہرے کو لال کئے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولے

"دیکھ لیا ہے میں نے بیٹا لفیر اور اس کی شرافت کو!

بس خاموش رہیئے میں نے بھی آپ کی شرافت کو دیکھ لیا ہے"۔ سیٹھ امتیاز علی نے طنزیہ کہا

"ایک شریف بیوی کے ہوتے ہوئے کسی کے گھنگھروؤں کی چھنکار سننا کہاں کی شرافت ہے۔"

ایک شریف انسان کی خدمت کو ٹھکراتے ہوئے متعدد بار دھوکے دینا اور وعدہ خلافی سے اپنی بیٹی کی شادی دوسرے کے ساتھ کر دینا اور پھر اسے گھر سے نکال دینا یہ کہاں کی شرافت ہے۔"

"بس خاموش رہے اس تجربے سے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے"

دوسرے کمرے سے ناہید ایک بیگ کو لے کر داخل ہوئی۔

سیٹھ امتیاز علی نے وہ بیگ اسلم کو دیتے ہوئے کہا

"یہ لو بیٹا اسلم! یہ تمہارا وہ انعام ہے جو تم نے ناہید کی عصمت

کو بچاتے ہوئے ہماری خدمت کے صلے میں حاصل کیا۔"

نہیں۔ ۔ ۔ ۔ اسے رہنے دیجئے۔ میں نے زرینہ کو سکھوں کے چنگل سے چھٹکارا دلایا تھا تو اس کے صلے میں کوئی انعام نہیں لیا تھا۔ اور اگر آج ناہید کی عصمت میری وجہ سے محفوظ ہو گئی تو اس میں کسی صلے کی گنجائش نہیں۔ میرے لیے یہ انعام کیا کم ہے کہ مَیں نے اپنی زندگی کو پالیا ہے" اسلم سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ گیے۔

"تو پھر تم ہی لو بیٹی زرینہ! بیٹیاں اپنے باپ کے گھر سے خالی ہاتھ نہیں جایا کرتیں۔ پکڑ لو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کسی سوچ کے بغیر لے لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا شریف باپ اسلم کو غریب سمجھ کر پھر سماج کے جھگڑوں میں الجھ پڑے اور تمہاری شادی پھر نصیر جیسے اوباش اور بدچلن مرد سے کر دے۔

ختم شد

نئی راہیں

زلفی اور پروین کے دھڑکتے ہوئے دلوں کی المناک داستان



منیر کاشانی

ایک سلجھے ہوئے گھرانے کی ازدواجی زندگی کا وہ تاریک باب جو ہر ایک کے لئے نصیحت آموز سبق ہے۔

زلفی۔ جس نے سب سے پہلے اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے نئی راہ اختیار کی —— اور —— پھر پروین نے زلفی کے لئے کئی نئی راہیں اختیار کیں۔ جہاں اسے ہزاروں مصائب سے کھیلنا پڑا۔

کیونکہ

وہاں پھول بھی تھے اور کانٹے بھی۔

آفتاب پبلشرز گوالمنڈی لاہور